دِل دماغ اور دُنیا
ہرچرن چاولہ

لوگ کہتے وہ جھوٹا ہے۔ میں سمجھتا رہا وہ سچ نہیں بولتا ہوگا۔
یہ سچا ہے۔ یہ جھوٹ سے نفرت کرتا ہوگا۔

میں نے پہلے سے نفرت کی۔ دوسرے کی راہ اپنائی کیوں کہ بزرگوں، مقدس کتابوں اور سیانوں نے مجھے یہی سبق پڑھایا تھا کہ جھوٹے سے نفرت اور سچے سے نہ صرف پیار کرو بلکہ اس کے نقش قدم پر بھی چلو مگر میں زندگی کے ہر شعبے میں بری طرح ناکام رہا۔ دوست بھی سب آہستہ آہستہ میرا ساتھ چھوڑ گئے۔

پھر میں نے ان ناصح بزرگوں اور کامیاب زندگی گذارنے والوں کے طور طریقوں کا گہری نظر سے جائزہ لینا شروع کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری عادتیں بہت زیادہ ناقابل درستی کی حد تک بگڑ چکی ہیں اور میں غلط راہوں پر اتنا آگے نکل آیا ہوں کہ اب پیچھے مڑنا اور نئے سرے سے سفر شروع کرنا میرے لیے مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔

وہ جگہ اور ماحول کے مطابق جھوٹ کہاں اور سچ کہاں بولنے اور ان کی مقدار کو موقع اور محل کے مطابق کم یا زیادہ کرنے یا صرف سچ بولنے مگر دو سچائیوں کو ضرورت کے مطابق آگے پیچھے کر لینے کے گر جان گئے تھے اس لئے زندگی میں کامیاب و کامران ہے۔ میں صرف سیدھا اور کھرا سچ بولتا تھا اسلیے ذلیل و خوار ہوا۔

دل، دماغ اور دُنیا

دل دماغ اور دُنیا

ہرچرن چاولہ

ادارہ فکرِ جدید
دریا گنج۔ نئی دہلی ۲

قیمت : پچاس روپے -/۵۰
اشاعت : ۱۹۹۲ء
سرورق : فضیلت
طباعت : جواہر آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

ناشر : اجے ڈِڈّن
ادارہ فکرِ جدید
۹۲۲، کوچہ روہیلا- تراہا بہرام
دریا گنج- نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

DIL DIMAGH AUR DUNIYA • SHORT STORIES

HARCHARAN CHAWLA •

IDARA FIKRE JADEED
922, KUCHA ROHELLA
DARYAGANJ,
NEW DELHI-110002 (INDIA)

ترتیب

کچھ اپنی کچھ ان کی

بچپن میں میں نے دیکھا تھا کہ میری ماں جب کچھ عرصے بعد اپنی بہنوں سے ملتی تھی تو بھی روتی تھی اور جدا ہوتی تھی تو بھی آنسو بہاتی تھی۔ اس کا جدائی کے وقت رونا تو مجھے سمجھ آتا تھا مگر ملتے وقت رونا میری سمجھ سے باہر کی چیز تھا مگر اب جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے اندر جانے وہ کون ہے جو ہر اچھی بات پر بھی روتا ہے اور ہر بری بات پر بھی جس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں تو مجھے اپنی ماں کی دونوں حالتوں میں رونے کی وجہ سمجھ آجاتی ہے۔ میں کسی دو مذہبوں کے انسانوں کو یا کسی دو دشمنوں کو گلے ملتے دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ میں مذہب کے نام پر ایک کو دوسرے کی پیٹھ میں چھرا گھونپتے دیکھتا ہوں تو میرے منہ سے ایسے کراہ نکلتی ہے جیسے وہ چھرا مجھے مارا گیا ہو۔ کسی بھی دوسرے کے ساتھ کوئی بھی بے انصافی مجھے اپنے ساتھ بے انصافی لگتی ہے اسی لیے میں نے کچھ لڑائیاں دوسروں کے لیے بھی لڑی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان ہی میں سے کوئی بعد میں ان ہی لوگوں کی گود میں جا بیٹھا ہے، اپنے اپنے ضمیر کی مجبوری ہے۔

کوئی دردناک واقعہ، اپنا یا کسی اور کا دکھ، کوئی ناانصافی مجھے ذہنی کرب میں مبتلا کرتی ہے اور یہ کرب میرے اندر کلبلاتا رہتا ہے۔ دنیا میں ثبات اک تغیر کو ہے۔ میرا یہ اندرونی دکھ بھی میرے اندر تغیر پذیر ہوتا ایک اور شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اسے آپ کہانی یا افسانے کا نام دے سکتے ہیں۔ مگر میں صرف میں تو نہیں ہوتا، پورا معاشرہ، ساری دنیا، سارا ماحول اور سارا اپنا آس پاس

ہوتا ہوں اور پھر میں جو بات کہتا ہوں وہ صرف میرے دکھ کی کہانی تو نہیں ہوتی، میرے سماج، ماحول اور آس پاس کی کہانی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری کہانیوں کے کچھ کردار ادھر ادھر سے نکل کر میرے سامنے آکھڑے ہوتے اور مجھ سے شکایت کناں یا خوش ہو جاتے ہیں کہ میں نے ان کا بھید کھول کر انھیں سر بازار ننگا کیوں کیا یا ان کی بات کہہ کر ان کے ذہن و دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

اپنے وطن سے کئی سمندر پار تارک الوطن ایک اور قسم کی بھاگتی، دھڑدھڑاتی، دمکتی، تیز رفتار، عجیب و غریب اور وطن سے مختلف قسم کے مسائل سے دوچار زندگی جی رہا ہے۔ وہ ان انگوروں کو کھٹا بھی کہتا ہے اور چھوڑتا بھی نہیں کہ پیچھے بھی اس پر سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ کم از کم پہلی اور دوسری نسل تو دو کشتیوں پر سوار ڈگمگاتی سی زندگی گذارتی رہتی ہے۔ ایسے حالات میں باہر ایک الگ قسم کا ادب تخلیق ہو رہا ہے جسے یہاں کے ماحول سے دور رہنے والا کوئی بھی بڑے سے بڑا ادیب نہیں لکھ سکتا۔ اسے صرف یہاں رہنے والا اور ان ہی دکھوں سکھوں سے جوجھتا کوئی بڑا یا چھوٹا قلم کار ہی صفحۂ قرطاس پر ٹھیک ڈھنگ سے اتار سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ناروے میں سولہ سال کا ایک لڑکا جب ایک ناول Pakkis لکھتا ہے تو وہ کئی پرانے لکھاریوں کو میلوں پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

ہمارے ملکوں سے چند روز کے لیے آنے والے کچھ ایک کو چھوڑ کر سب قلم کار بھی ہماری صحیح تصویر نہیں پیش کر سکتے کیونکہ اتنے تھوڑے عرصہ میں ہمارے مسائل سے واقفیت اُن کے لیے ایک ناممکن سی بات ہوتی ہے۔

ہرچرن چاولہ
Mollefaret-50A,
0750 OSLO-7. (Norway)

میری بیوی کا خاوند

عجیب شخص ہے۔ پچھلے تین دن سے میرے گھر آتا ہے۔ باہر کی چابی اس کے پاس ہے دروازہ کھولتا ہے، اندر آتا ہے۔ نہ دعا نہ سلام، نہ جان نہ پہچان، نہ مجھ سے کوئی بات نہ کلام، اپنے کام سے کام۔ سیدھا کچن کی طرف چلا جاتا ہے، اپنی مرضی کا پکاتا، کھاتا اور دو منزلہ پلنگ کی اوپری منزل پر چڑھ کر پڑ جاتا ہے۔ دو ہی منٹ بعد خراٹے لیتا دن بھر سویا رہتا ہے۔ بیچ میں بھوک پیاس لگی یا حاجت ہوئی تو اٹھتا ہے اور حسب ضرورت کچن یا ٹائلٹ کا ایسے رخ کرتا ہے جیسے نیند میں چل رہا ہو اور آس پاس کے تمام وجودات سے بے بہرہ ہو۔

آج چوتھے روز میں نے اپنی بیوی سے شکایت کی ہے کہ آخر وہ ہے کون شخص، جس کے پاس ہمارے گھر کی باقاعدہ چابی تک موجود ہے اور کچن کا تمام سامان اور سارا گھر جیسے اس کے باپ کی جائیداد ہو۔ جب کہیں اپنی رگ دبتی ہو تو آدمی صرف شکایت ہی تو کر سکتا ہے۔ ✓

اپنی شکایت کے جواب میں اپنی بیوی کا بیان آپ کو سنانے سے پہلے میں آپ کو ہمارے میاں بیوی کے رشتے سے جان کاری کرا دوں تو بات کی تہہ تک پہنچنے میں آپ کو آسانی رہے گی۔ میاں بیوی کے رشتے کی جانکاری ؟ آپ حیران نہ ہوں۔ میاں بیوی کا رشتہ دراصل کوئی رشتہ ہی نہیں۔ ہے تو ہے، نہیں تو بس نہیں۔ یہ رشتہ دوسرے رشتوں سے زیادہ

نزدیکی اور نازک ہوتا ہے۔ ماں باپ کے ساتھ آپ زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کی عمر تک بیڈ شیئر کر سکتے ہیں۔ بہن بھائیوں کا ساتھ بھی چند سالہ ہوتا ہے۔ مگر میاں بیوی کا ساتھ زندگی بھر رہتا ہے۔ یہ تو ہوئی نزدیکی کی بات۔ اب ذرا اس رشتے کی نزاکت کی بات بھی سن لیجئے۔ آپ ہزار شور مچائیں۔ ماں باپ، بھائی یا بہن کو ڈنکے کی چوٹ کہیں کہ میرا تمہارا کوئی رشتہ نہیں مگر پھر بھی وہ ماں باپ، بھائی اور بہن ہی رہتے ہیں۔ اور کوئی قانون بھی آپ کے ناطے کو توڑنے میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتا مگر بیوی سے آپ صرف ایک لفظ طلاق کو تین بار دہرا کر چھٹکارہ حاصل کر سکتے ہیں اور سارا سماج اور دنیا بھر کا قانون آپ کی مدد پر آ کھڑا ہوتا ہے۔

مجھے بات اور کرنی تھی اور میں بالکل دوسری لائن پر چڑھ گیا۔ سگنل غلط ہوں تو گاڑیاں غلط لائن پر نکل جاتی اور حادثات کا شکار بھی ہو جاتی ہیں۔ اس شخص کو دیکھ دیکھ کر پچھلے تین دن سے میرا دماغ گھڑن چوبنا ہوا ہے۔ کرنا کچھ ہوتا ہے، کر کچھ بیٹھتا ہوں۔

تین سال پہلے کی بات ہے۔ میں اس نئے ملک آیا تھا۔ صحت اچھی تھی۔ بھوک تیز لگتی تھی۔ کام لگ جانے سے چار پیسے بھی جیب میں جمع ہو گئے تھے۔ میں کبھی کبھی شام کو اوسلو کے سب سے بڑے انڈین ریسٹورنٹ "بی کاک" میں جا بیٹھتا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نارویجین لڑکی چڑپولی سے ہوئی۔ مجھ کالے کلوٹے بینگن لوٹے میں جانے اسے کیا بھا گیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی اور ایک قدآدم آئینے کے سامنے کھڑا کر کے مجھے اور خود کو کئی بار دیکھا۔ آئینے میں خود اور اسے اکٹھے دیکھ کر مجھے بہت شرم آئی۔ بالکل بلیک اینڈ وائٹ فلم تھی۔ ویسے میں کوئی ایسا بھی کالا سیاہ نہیں، بس اس کے ساتھ کھڑا ہونے کے بعد مجھ پر احساس کمتری حاوی ہو گیا تھا۔ میرے منہ سے نکل گیا، "تمہیں مجھ کالے توے میں کیا نظر آیا ہے جو مجھے آئینے کے سامنے کھڑا کر کے بار بار خود کو اور مجھے دیکھ رہی ہو۔"

"وہ بولی۔ مجھے تمہارا گندمی رنگ بھا گیا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے میں دن رات ورزشیں کرتی رہتی ہوں۔ باقی تھوڑی بہت کمی تو ہر کسی میں ہوتی ہے۔ میں کون سی کوئی دیوی ہوں۔"

پھر وہ مجھے ساتھ والے دوسرے کمرے میں لے گئی جو ایک طرح سے اس کا ورزش خانہ تھا وزن اٹھانے کے ساز و سامان، ایرگومیٹر سائیکل، سپرنگ، دوڑ لگانے کے لیے بجلی سے چلتے ہوئے پلیٹ فارم کی الیکٹرک مشین اور جانے کیا الم غلم ورزشوں کا سامان تھا جو اس نے وہاں جمع کر رکھا تھا۔ دیواروں پر اس کی انگیا اور چڈی میں چند تصویریں آویزاں تھیں جیسی پہلوانوں کی نمائش جسم کی ہوتی ہیں۔

اس نے میری مونچھوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا، "مجھے تم بہت اچھے لگتے ہو۔ کہاں رہتے ہو؟"

"یونیورسٹی سٹوڈنٹ ٹاؤن۔ ایک دوست کے ساتھ۔ میرے پاس رہنے کی جگہ نہیں ہے۔" میں نے ایک ہی فقرے میں اپنے دکھ کی ساری حقیقت اگل دی۔

"ویری گڈ۔ تو ایسا کرو۔ کل سے یہاں آجاؤ۔ مجھ اکیلی دم کے لیے یہ مکان کافی سے زیادہ ہے مگر ایک شرط ہے تم مجھے بیگم کہا کرو گے۔ وہ بھی یہی کہتا تھا۔" "بیگم۔" میں نے سوچا بیچاری بیوہ ہے شاید اپنے کسی ہم وطن کی۔ چلو اسے سہارا ہو جائے گا اور مجھے بھی سر پر چھت نصیب ہو جائے گی۔ مگر بیگم اپنے لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ "بیگم تو بیوی کو کہتے ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اور وہ مجھے اندر کراس پر ٹنگے کرائسٹ کے بت کے پاس لے گئی۔ خود اور مجھے چھاتی پر کراس بنواتے ہوئے بولی۔ "لو آج سے میں تمہیں اپنا خاوند مانتی ہوں۔"

ارے یہ تو بالکل ویدی طریقہ ہے۔ راجہ دشینت نے بھی شکنتلا سے یہی کہا تھا اور شکنتلا نے جنگلی پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال کر اسے قبول کر لیا تھا۔ "میں بھی آج سے تمہیں اپنا پتی مانتی ہوں۔" اس نے کہا تھا۔

یہ تو بہت اونچے درجے کی شادی مانی جاتی ہے۔ میں نے دل کو بہلا لیا تھا۔

اس نے میری بانہہ تھامی تھی اور کچن کی طرف لے جاتے ہوئے کہا تھا، "کچھ کھاؤ گے؟" کھانا پینا بھول کر میں اس کے ہاتھ کی گرفت کی مضبوطی کے بارے سوچتا رہ گیا تھا۔ اس کا پنجہ تھا کہ کوئی لوہے کی مضبوط پلاس، جس میں میری کلائی جکڑ دی گئی تھی۔ خیر صحت میری بھی بہت اچھی ہے۔ عمر بھی کوئی زیادہ نہیں۔ اچھا کھاؤں گا، تھوڑی سی ورزش کر لوں گا تو اسے

کلائی پکڑنا بھلادوں گا۔ ویسے بھی عورت کا کیا ہے۔ سو پہلوان بنتی رہے مسٹری ایک ہی ہلے میں نیچے آجاتی ہے۔ میں نے سوچا اور کچن میں دوبارہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

اسے میرا ہندوستانی کھانے کا ڈھنگ بہت پسند آیا۔ بولی "بالکل شیر کی طرح کھاتے ہو۔ میرا مطلب ہے لت پت ہو کر۔"

جب میں نے اسے بتایا کہ میری ڈیوٹی رات کی ہوتی ہے اور دن بھر گھر پر ہوتا ہوں تو وہ بولی۔ "مجھے معلوم ہے۔ پی کاک کا شیف نے بتایا ہے۔"

میں سمجھ گیا۔ وہ کئی ہفتوں سے پی کاک آرہی تھی۔ پی کاک کے لذیذ ہندوستانی کھانے نارویجنوں کو گشاں گشاں اور سلو کے تو ٹین گاتے پہلے آتے ہیں۔ میں نے سمجھا تھا۔ اسے بھی شاید ان ہی لذیذ کھانوں کی کشش 'پی کاک' لارہی تھی مگر نہیں' اسے تو میں ہی کوئی کھانے کی چیز لگا تھا اور اندر کھاتے اس نے میرے متعلق شیف سے پوری جانکاری حاصل کرلی تھی۔

شہر کی بڑی لائبریری میں اس کی ڈیوٹی صرف چار گھنٹے ہوتی تھی۔ صبح دس بجے گئی اور دو بجے واپس۔ گھر سے لائبریری کوئی خاص دور بھی نہیں تھی صرف دس بارہ منٹ چلنے کے بعد وہ لائبریری پہنچ جاتی تھی۔ فیکٹری میں اپنی رات کی ڈیوٹی کے بعد میں اس کے جانے سے گھنٹہ بھر پہلے آجاتا تھا۔ میرے کپڑے بدلتے' منہ ہاتھ دھوتے اس کے جانے کا وقت ہو جاتا۔ پھر میں ہوتا اور کچن' انجانے یہ میری اچھی صحت کی وجہ سے تھا یا رات کی سخت ڈیوٹی کے کارن' کہ میں بھوکے شیر کی طرح فریج پر ٹوٹ پڑتا۔ جب تک کھاپی اور تھوڑا سا آرام کرکے میں تازہ دم ہو جاتا تب تک وہ واپس آجاتی اور پھر ہم مل بیٹھتے' گپ شپ' کھانا پینا' ٹی وی' فلم اور آرام۔ شام کو دل چاہتا تو پھر پی کاک' یا کسی ڈانس بار میں جا بیٹھتے' یا میں ہی قسم قسم کے حلوے بناتا اور بگاڑتا رہتا۔ اسے خاک سمجھ تھی کہ حلوہ کیا ہوتا ہے۔ وہ تو بس انگلیاں ہی چاٹتی رہ جاتی۔ ہو سکتا ہے مسٹری مجھے خوش کرنے کو اداکاری ہی کرتی ہو۔

خیر وقت بہت اچھا گذر رہا تھا۔ اوپر والے کی مہربانی سے مجھے کہیں بھی کوئی مات نہیں تھی۔ ہر میدان میں فتح ہی فتح میرے قدم چوم رہی تھی کہ جانے کب کباب میں ہڈی بن کر وہ کہیں سے آن ٹپکا۔ آخر میں اس سے جھگڑنا پڑا مگر یہ یک طرفہ جھگڑا تھا۔ ادھر سے

ایک چپ سو سکھ کا معاملہ تھا۔ اس کے تو کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔

دوسرا ملک، میں پردیسی، بے سہارا۔ وہ گورا میں کالا۔ میں نے بیوی سے شکایت کی: "کون ہے یہ شخص، جسے تم نے باقاعدہ گھر کی چابی تک دے رکھی ہے۔ اندر ایسے آتا ہے جیسے اپنے گھر آرہا ہو۔"

پھر میں نے سوچا شاید اس کا کوئی رشتہ دار ہو اور سچ مچ ہی جیسے اپنے گھر آتا ہو۔ میں نے شکایت میں تھوڑی سی ملائمت گھولتے ہوئے کہا، "کم از کم ہیلو تو کہہ دیا کرے۔"

"اپنا ہی آدمی ہے۔ اپنے گھر آتا ہے۔ تمہیں نہیں بلاتا تو کیا ہوا، تمہیں کچھ کہتا تو نہیں۔" وہ بولی۔

"میں تمہارا خاوند ہوں۔ مجھے تو کچھ پتہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے گھر کون آتا جاتا ہے۔" میں نے اپنا مشرقی شوہرانہ حق جتاتے ہوئے کہا۔

"اسے بھی تو تمہارے بارے کچھ زیادہ علم نہیں۔ اس نے تو کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔"

"مگر وہ ہے کون؟" مجھے خود بھی محسوس ہوا کہ میری آواز میں سختی ضرورت سے کچھ زیادہ آگئی ہے۔

"میرا نائٹ ہسبنڈ۔" اس نے ایسے کہا جیسے کوئی گھر میں آئے نئے صوفے، کرسی یا میز کے متعلق بتاتا ہے۔

"اگر وہ تمہارا ہسبنڈ ہے تو پھر کیا ہوں؟" میری آواز کی سختی ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔

"تم بھی ہسبنڈ ہو، ڈے ہسبنڈ۔"

ڈے ہسبنڈ، نائٹ ہسبنڈ۔ سالی اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ میرے اندر کا مشرقی مرد اپنی پوری قوت سے جاگ اٹھا۔ اسے مارنے کو میرا ہاتھ اٹھا ہی تھا کہ اس نے کسی پہلوان کی طرح مجھے کمر سے پکڑ کر گرا لینا چاہا مگر بہترین خالص خوراکوں اور ورزشوں نے مجھے گینڈا بنا دیا تھا۔ ایک ہی جھٹکے میں میں نے اسے نیچے دبا لیا اور کہا، "بول ہار گئی نا۔ رہ گئی نا تیری پہلوانی توڑ دوں تیری گردن کا منکہ۔"

نیچے پڑی، نتھنے پھلاتی اور گدھ کی طرح جھپٹاتے ہوئے وہ بولی: "ہار، ہارنے میں نہیں،

مارنے میں ہوتی ہے اور میں تجھ جیسے سے ہار نہیں مانتی۔ اس نے چھ مہینے سے اف تک نہیں کی۔ چار دن کی چھٹی پر دہ گھر گیا رہا ہے، تم نے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔ یہاں رہنا ہے تو مل جل کر رہنا سیکھو ورنہ دروازہ ادھر ہے۔"

اپنے ملک میں بڑی آزادیاں تھیں۔ دفاتر جلا دو، بسیں سپرد آتش کر دو، بیویوں کو زندہ پھونک ڈالو، کوئی پوچھتا تک نہیں تھا۔ یہاں کسی کی گردن توڑنا تو ایک طرف، تنکہ توڑ کر سڑک پر گراتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی اور ہانپتا ہوا چپ چاپ صوفے پر جا بیٹھا۔

پہلا آدمی

سُندر نے کبھی کُشتی نہیں لڑی تھی، پہلوانی نہیں کی تھی مگر دھرتی کی اس نے بچپن سے ہی دل کھول کر سیوا کی تھی اور پنجاب کی دھرتی ماں اپنی خدمت کے عوض اپنے بیٹوں کو کبھی بھوکا نہیں سونے دیتی بلکہ اپنی طاقت ور خوراک سے ان کی رگوں میں بجلیاں بھر دیتی ہے۔ پنجاب کا وہ جاٹ، دھرتی کی گود سے جنما اور دھرتی کی گود میں ہی پلا بڑھا تھا۔ دھرتی کے بیٹے پہلوانی کریں نہ کریں، کُشتی لڑیں نہ لڑیں۔ یوں ہی سڈول جسموں کے مالک بن جاتے ہیں جیسے گاؤں کی کھلی فضائیں اور تازہ ہوائیں کوئی سانچہ ہوں جس سے گذر کر ان کا لڑکپن جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہو تو ان کا رنگ روپ اور قد کاٹھی کچھ نرالی ہی قسم کی نکل آتی ہو۔

دھرتی نے اسے کبھی بھوکا نہیں رکھا تھا الٹا تھوڑی سی خدمت کے عوض کئی گنا زیادہ دیا تھا مگر ماں باپ کی بے وقت موت کے بعد وہ بھی دوسروں کی طرح بھیڑ چال کا شکار ہو کر فارن پہنچ گیا۔ فارن نے ایک بے رحم محبوبہ کی طرح اس کی ماں کا کلیجہ مانگا تھا اور اس نے ماں کا کلیجہ نکال کر اسے پیش بھی کر دیا۔ مگر ماں پھر بھی قدم قدم پر اس کی خیر مناتی رہی تھی۔ اس کی ہر ٹھوکر پہ بے چین ہوتی رہی تھی۔ اس نے زمین کا ایک بڑا ٹکڑا بیچ کر لندن کا ٹکٹ خریدا تھا اور لندن کی ظاہری چمک دمک میں بھول گیا تھا کہ اس نے کیا کھو دیا ہے مگر ماں اسے نہیں بھولی تھی۔ اس نے ہمیشہ اس کی پہلوان نما شخصیت اور صحت مند جسم کو برقرار رکھا تھا اور اس کی رگوں میں پہنچایا ہوا اپنا گرم خون کبھی واپس نہیں مانگا تھا۔

پہلے پہل اس کی جُدا رنگت، کالے بالوں اور بھرپور مرعوب کن شخصیت سے کچھ گوری میمیں اس کی طرف راغب ہوئی تھیں۔ اسے بھی ان کا سراپا سانچے میں ڈھلا، بال سونے کے لچھے، لب گلاب کی پنکھڑیاں اور ہری نیلی آنکھیں کانچ کی خوبصورت گولیاں محسوس ہوئی تھی اور وہ ایک بچے کی طرح ان کی طرف بڑھا تھا۔ ان سے کھیلا تھا اور بچے کی طرح جلدی ہی ان سے دور بھی ہو گیا تھا۔ اب اسے گوری صورتیں ناتراشیدہ لکڑی کی مورتیں لگتیں اور جب وہ ان پر ہاتھ پھیرتا تو اسے لگتا جیسے وہ پتھر یا لکڑی کے کھردرے لٹھوں پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔ اسے بال کٹی، دھوپوں میں لیٹی، گوری گوری ننگی میمیں ایسے لگتیں جیسے برفوں کے گلیشیر، سمندروں سے نکل کر شہر کی سڑکوں پر آگئے ہوں۔ بے حس، یخ بستہ، برف کے ڈلے۔

اس نے دہلی کے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ وہ کسی انڈین لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جو شرم و حیا کے زیور سے آراستہ ہو جس کے بال لمبے، کالے اور گھنے ہوں، چہرے کے نقوش مشرقی حسن کا بہترین شاہکار اور قد سرو کی مانند ہو۔ اس کے خوب صورتی کے پیمانے پر ہر لحاظ سے پوری اترتی حسینہ اسے بڑی آسانی سے اپنے ہی گاؤں سے مل سکتی تھی مگر اسے یہ بھی تو سوچنا تھا کہ اس کی بیوی بن کر لندن آنے والی لڑکی انگریزی کی بہت اچھی شد بد رکھتی ہو تو سونے پر سہاگے کا کام دے گی۔ اسی لیے اسے دہلی جیسے بڑے شہر کی کوئی بھی پڑھی لکھی لڑکی مناسب جیون ساتھی محسوس ہوتی تھی۔ کچھ تحفے بھیجنے، بار بار لکھنے اور ٹیلی فون کرنے پر اس کے دوست نے اسے چھ سات لڑکیوں کے فرنٹ، پروفائل اور مختلف پوزوں کے فوٹو بھجوا دیئے تھے، دہلی اور ایسے دوسرے بڑے شہروں میں رشتے، ناطے کروانے کا کئی لوگوں نے باقاعدہ بزنس شروع کر رکھا تھا۔ ایسے ذرائع سے بیوی حاصل کرنا تھوڑا سا رسکی ضرور تھا، مگر نظر رکھنے والے کو ان ہی ریگستانوں سے بعض اوقات بہت ہی اچھے اور قیمتی ہیرے حاصل ہو جاتے تھے۔

جتنے کا وہ اپنے لیے واپسی ٹکٹ خریدتا۔ اس سے کئی گنا زیادہ کے اس نے آشا کے لیے کپڑوں، زیوروں اور تحفوں کے ساتھ ساتھ ایک خوب صورت سا نیا فلیٹ بھی خرید لیا تاکہ جب وہ اس کے پاس آئے تو اسے نہ صرف پروانہ قسم کا شوہر، بلکہ گھر کی ہر چیز خوش آمدید

ہتی محسوس ہو۔ دل بھر کر اِدھر اُدھر بھٹکنے اور بے مزہ کھیتوں میں منہ مارنے کے بعد اب اسے ہزار جان اور صدقِ دل سے ایک مشرقی حسینہ کا انتظار تھا۔ ٹیلی فون پر شادی کے اٹھارہویں دن بعد جب آشا ہیتھرو ایرپورٹ پر پسنجر لاؤنج سے باہر آئی تو وہ ایک ہی نظر میں اسے پہچان گیا۔ وہ اس کے خوابوں کی پری سے بھی ہزار گنا زیادہ حسین تھی اور عروسی جوڑے میں تو وہ ایسے لگ رہی تھی جیسے کوئی دیوداسی کسی مندر سے دیوتا کی آرتی اتار کر باہر آرہی ہو۔ جب وہ لگیج بیلیٹ سے اپنا اٹیچی اٹھانے کو جھکی تو سُندر کو لگا جیسے اس کی چوٹی کے ناگن نے زمین کو نہیں اس کے دل کو ڈس لیا ہے اور ایک میٹھا میٹھا سرور آمیز درد اس کی نس نس سے شرارتیں کرنے لگا ہے۔ دائیں ہاتھ میں لٹکے اٹیچی سے جب آشا کے پاؤں سے ساڑھی کا کونہ اٹھا تو سُندر اس کے گورے گورے پاؤں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا جیسے دور کہیں بجلی نے کوندا مارا ہو۔ پل بھر کے لیے وہ کھو گیا۔ کیا واقعی جسے وہ دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کی بیوی بن کر اس کے پاس آگئی ہے۔

سُندر رہتا ضرور لندن ہی میں تھا مگر کام باہر ایک فارم پر کرتا تھا۔ اپنی کار پر صرف آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ فارم پر پہنچ جاتا تھا۔ پہلے پہل اس نے ایک فیکٹری میں کام شروع کیا تھا مگر مشینوں کی گڑگڑاہٹ سے وہ جلدی ہی اکتا گیا۔ اسے لگتا جیسے مشین اسے چیر پھاڑ کر کسی دوسری جگہ فٹ آنے کے لیے ایک پرزے کی طرح گھڑ رہی ہے پھر ایک دن وہ ان مشینوں کی دنیا سے بھاگ کر قدرت کی گود میں پہنچ گیا۔ یہاں اسے گلاس ہاؤسوں میں پھول، سبزیاں اور پھلوں کے پودے اگانے پڑتے۔ مٹی سے لت پت ہاتھوں سے وہ ننھے منے پودوں کی دیکھ بھال کرتا اور زمین سے گملوں میں منتقل کرتا تو اسے لگتا جیسے وہ ننھے منے بچوں کی کلکاریوں میں گھرا، خود بھی ایک بچہ بنا، ان سے کھیل کود کر رہا ہے۔ فارم میں کام کرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا جیسے وہ دھرتی ماں کی گود میں واپس پہنچ گیا ہے۔

زندگی بہت اچھی، پُر سکون اور رواں دواں گذر رہی تھی۔ گھر میں بھی کلیاں پھول بن رہی تھیں۔ دہلی سے آنے کے بعد نہ صرف آشا خود کھلے ہنستا مسکراتا، ابھرا ابھرا سا کیلنڈر دو لا

کا پھول بن گئی تھی بلکہ جیسے گھر کی ہر چیز پر حسن اور نکھار آگیا تھا۔ آشا کے جسم پر ہلکا ہلکا گوشت چڑھ آیا تھا۔ اتنا مختصر کہ جیسے تاج محل کو —— چاندنی کا پینٹ کیا گیا ہو۔ اس کے بھرے بھرے گول گول ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء اور بھی زیادہ دلکش اور خوب صورت ہو گئے تھے۔ یہ نسوانی حُسن کا نقطۂ عروج تھا۔ سُندر سوچتا بس آشا کو اپنی تکمیل کے اس روپ کو یہیں روک دینا چاہیئے۔ پھول کو حسن کی آخری آماجگاہ پر کافی دیر تک روکے رکھنا ہی حسن کی سب سے بڑی قدر دانی ہے، کیونکہ آگے کھائی تھی۔ ڈھلان، جہاں عورت کا حسن گرتا ہے تو پھر نہیں اٹھ سکتا۔ خوب صورتی کا سب سے بڑا دشمن موٹا پا ہے، اور یورپ میں اس بیماری کو کنٹرول کرنا ذرا بھی مشکل نہیں۔ صبح کی سیر، ہلکی سی دوڑ، گھر یا یوگا سکول میں چند کسرتیں۔ ویک اینڈ پر پہاڑوں کی لمبی لمبی سیریں۔ سوئم اینڈ ٹرم (Swimme and Trim) کلب کی ممبر شپ۔ جہاں تیراکی کے ذریعے جسم کو معقول حد تک دُبلا پن اور صحت مندی کی سرحد پر روکا جاسکتا ہے۔ اور ایسے ہی یہاں میسر دوسرے بیسیوں ذرائع ہے۔

سُندر نے آشا کو سوئم اینڈ ٹرم کلب کا ممبر بنوا دیا مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ وہاں جانے کی باقاعدگی سے پابندی نہیں کرپاتی تو یہ سوچ کر وہ خود بھی اس کا ممبر بن گیا کہ اس کے ساتھ کی وجہ سے کم از کم آشا کی حاضریوں میں بھی پابندی آجائے گی ورنہ خود اس کے لیے فارم کا کام ہی اتنی بڑی ورزش ہو جاتا تھا کہ اسے دوبارہ کسی قسم کی ورزش کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی —— سُندر کے مردانہ حُسن اور سڈول جسم نے سوئمنگ پول پر آئی کئی عورتوں کو اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ یہ بات آشا نے بھی محسوس کی مگر وہ خاموش رہی۔ کرتی بھی تو کیا۔ کسی کی آنکھیں تو بند نہیں کی جاسکتیں یا ایسا کوئی حکم بھی نہیں لگایا جاسکتا کہ میرے مرد کی طرف دیکھنا منع ہے۔ وہ خود بہت خوب صورت تھی۔ اس کی طرف بھی کئی مرد بھوکی نظر دل سے دیکھتے تھے۔ مگر اسے وہ نظریں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ صرف وہی کانٹوں کی طرح چبھتی تھیں جو سُندر کی طرف اٹھتی تھیں اور وہ نظریں دن بدن اس کے اندر ایک قسم کا احساسِ کمتری جگاتی تھیں، وہ سوچتی جیسے وہ ڈھل

رہا ہے۔ ختم ہو رہی ہے، سوچ کا یہ انداز اسے گمراہ کن وادیوں کی طرف لیے جا رہا تھا۔ کچھ عرصے بعد سُندر نے بھی محسوس کیا کہ سوئم اینڈ ٹرم کلب میں جانے کا مقصد ہی فوت ہوا جاتا ہے تو وہ ڈرنے لگا کہ کہیں آشا کے شک کی گمراہیوں میں وہ اپنی خوب صورت اور پیاری بیوی کو ہی کھو نہ بیٹھے۔ یہی سوچ کر اس نے ایک دن آشا کے سامنے ایک نئی تجویز رکھی۔

"آشا۔ میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو گئے ہیں۔ کچھ بنک سے ادھار مل جائیں گے۔ میں سوچتا ہوں۔ ہم اپنا ہی ایک فارم خرید لیں۔ ہم دونوں کے لیے ایک ہی جگہ کام بھی نکل آئے گا اور صحت بھی ٹھیک رہے گی۔"

"مگر میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔" وہ بولی "تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں تو بہت ہی اچھی بات ہے، میری ایک سہیلی بیوٹی ایڈز (Beauty Aids) کی ایک دوکان بیچنا چاہتی ہے۔ میں چاہتی ہوں اسے خرید لوں۔ چند پیسے بھی آنے لگ جائیں گے اور میں بھی کام سے لگ جاؤں گی۔ یہ کام صاف ستھرا بھی ہے اور مجھے پسند بھی۔"

وہ اپنے لیے سُندر کی کمزوری سے واقف تھی۔ کچھ دن بحث و مباحثہ چلتا رہا۔ وہ کبھی روٹھ گئی، کبھی من گئی، کبھی خوش، کبھی ناراض، کچھ نخرہ کیا، کچھ ادائیں دکھائیں اور کچھ عرصہ بعد اسے رام کرنے میں کامیاب ہو گئی اور پھر کچھ عرصہ بعد وہ "آشا بیوٹی ایڈز" نام کی شاپ پر بطور مالکن کھڑی تھی اور اس کے آس پاس سجی تھیں یونو جنریشن سکن کیئر کی کئی قسم کی کریمیں جن کی ڈبیہ ہی کسی حسینہ کی طرح خوب صورت اور ملائم لگتی تھیں، جن کی پتلی کمر دل میں سنہری اور روپہلی ربن بندھے تھے۔ جن کے نام اور اقسام ستاروں کی طرح لشکارے مارتے تھے۔ رائل ویلویٹ، الٹرا ریچ کمپلیکس، اور جانے کن کن ناموں کی رات کو سونے سے پہلے استعمال ہونے والی کریمیں ہاتھوں اور پاؤں کو ملائم رکھنے والے لوشن، اور ملی نیلم چہرے کے میک اپ، لپ سٹک، نیل پالش، ہر لباس اور ہر رنگ سے میچ کرنے والے، آئی شیڈز، کوہل پنسل، کاجل پین، نہانے کے لیے سافٹ اور سلکی شاور جیل، بالوں کو نرم اور ملائم رکھنے والے جڑی بوٹیوں، سیبوں، انڈوں وغیرہ کے کئی قسم کے شیمپو، غسل آفتاب سے پہلے اور بعد میں استعمال آنے والے لوشن، پیرس کے اعلیٰ عطر۔ تمام جسم کو رنگ و

نور عطا کرنے والے لوشن، ایسے ایسے عطریات، ختم ہو جانے پر جن کی دل پذیر شیشی بھی پھینکنی مشکل محسوس ہو۔ ساتھ ہی نقلی سونے چاندی میں جڑے نقلی ہیرے موتیوں کے کنگن، بُندے نیکلس، انگوٹھیاں اور بے شمار دوسری قسموں کے زیورات اور ایسی ہی عورتوں کے کام آنے والی بے شمار دوسری چیزیں۔

گھر اور کچن کا تمام خرچ وہ سُندر سے کرواتی، اوپر سے اس کا نت نئے فیشن کے ملبوسات کا شوق، سُندر کی تمام آمدنی ہڑپ کر جاتا مگر اسے تمام اخراجات برداشت کرتے ہوئے خوشی ہی ہوتی کہ وہ اسی کے لیے ہی تو اپنے آپ کو سجاتی اور سنوارتی ہے۔ رہی دکان، تو ہر کوئی جانتا ہے کہ دکان پہلے سال کھاتی ہے۔ دوسرے سال سنبھلتی ہے اور تیسرے سال کھلانا شروع کرتی ہے۔ ڈیڑھ سال ایسے ہی گذر گیا اور جب سُندر نے دیکھا کہ دکان سے تو کچھ بھی گھر میں نہیں آ رہا ہے تو وہ چونکا۔ ایک دن اچانک فارم پر جلدی چھٹی ہو جانے کی وجہ سے گھر آتا ہوا راستے میں دکان پر پہنچ گیا تو اس نے دیکھا کہ دکان بند پڑی ہوئی ہے۔ وہ ابھی دروازے پر تھوڑی ہی دیر رکا تھا کہ اسے دور سے آشا آتی دکھائی دی۔ اس کے قریب آنے پر سُندر نے پوچھا۔ "کہیں گئی تھیں؟"

"ہاں۔ پاس ہی اُدھر دائیں طرف مڑ کر ایک وومن ہیلتھ کلب (Women Health Club) ہے۔ وہاں عورتوں کو ورزشیں کرانے کے کئی قسم کے ساز و سامان ہیں۔ ساتھ ہی ایک ہال پریکٹس کرنے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ تھوڑی سی ماہانہ فیس ہے۔ دن بھر کھڑے کھڑے میری ٹانگیں اکڑ جاتی ہیں تو کچھ دیر کے لیے وہاں چلی جاتی ہوں۔ کلب کی مالکن میری سہیلی ہے، مجھ سے آدھی فیس لیتی ہے۔"

بات جائز تھی۔ سُندر چپ سا دھ گیا مگر آشا وہاں کی باقاعدہ ممبر ہوتی تو بندھے ٹکے اوقات میں کچھ دیر کے لیے جاتی۔ اسے جلدی ہی پتہ چل گیا کہ وہ جب اس کا جی چاہتا ہے، دکان بند کرتی ہے اور اس ہیلتھ کلب میں پہنچ جاتی ہے، وہ دو تین بار دوسرے اوقات میں دکان پر پہنچا تو بھی اسے بند پایا۔ صاف ظاہر تھا کہ آشا ورزش

اور صحت کے شوق میں دکان کو نظر انداز کر رہی تھی۔

حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ورزشوں نے آشا سے اس کا نسوانی حسن چھین لیا تھا جس پر مرد سو جان سے نچھاور ہو جاتا ہے۔ ہاتھ پھیرتے ہوئے رات کو آشا کا سخت اور کھردرا جسم اسے اس مچھلی کی طرح لگتا جس کے ریشوں سے ہاتھ چھل جاتے ہیں۔ آشا کے جسم کی سب نزاکت اور ملائمت ختم ہو گئی تھی۔ آشا خود بھی اس سے دن بدن دور ہوتی جا رہی تھی۔ سُندر کے ہاتھ اسے پھر سے گھڑ کر نرم اور ملائم کر دینے والی مشین لگتے۔ اسے لگتا جیسے سُندر کے ہاتھ اس کے تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیں گے۔ کام کی وجہ سے دن کو تو وہ ایک دوسرے سے دور رہتے ہی تھے۔ رات کو بھی آشا کی لاپرواہی اور احتراز کی وجہ سے انھیں بیڈ ٹائم کمپنی (Bed Time Company) کم ہی نصیب ہوتی تھی۔ سُندر سوچتا کہ آشا ایک ماں بن گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سُندر کو گھر میں ایک خوب صورت سے بچے کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا ایک بچے کی کلکاریاں اس کے گھر کی تمام خوشیاں اسے واپس لوٹا دیں گی۔ اسی لیے تو قدرت نے مرد اور عورت کو جدا جدا بنایا ہے۔ اس نے آشا کو دوا کی کچھ گولیوں کا باقاعدگی سے استعمال کرتے دیکھا تھا۔ ایک دن اس کے استفسار پر اس نے کہا۔ "کچھ وٹامنز ہیں۔ صحت قائم رکھنے کے لیے صرف ورزشیں ہی تو کافی نہیں ہوتیں۔"

سُندر کو شک کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ اعتماد کرنے اور اعتماد پانے میں یقین رکھتا تھا۔ اس نے دوبارہ آشا سے اس کی مصروفیات یا گولیوں کے بارے کبھی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا مگر ایک دن جب وہ ایک پرانے دوست کا پتہ ڈھونڈنے کے لیے بیڈ روم کی آشا والی سائیڈ ٹیبل سے اپنی دو سال پرانی ڈائری تلاش کرتا ہوا چیزیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ اس کی نظر گولیوں کی ایک شیشی پر پڑ گئی۔ جس پر لکھا تھا۔ "اینٹی بے بی گولیاں۔" کچھ دن بعد یہ یقین ہو جانے پر کہ آشا وہی گولیاں باقاعدگی سے استعمال کر رہی تھی۔ اس نے آشا سے پوچھا۔

"آشا تم ماں بننا پسند نہیں کرتیں؟"

آشا کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو سُندر نے اسے وہ شیشی دکھادی۔ آشا تڑپ کر غصّے سے بولی۔

"تم میرے پیچھے میری درازوں کی تلاشیاں لیتے رہتے ہو۔"

"نہیں۔" سُندر نے پُر سکون اور ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔ "اپنی پرانی ڈائری کی تلاش میں اچانک اس پر نظر پڑ گئی۔"

"تو خیر سن لو۔ میں چھپاؤں گی بھی نہیں۔ فی الحال ماں بننے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ تمہارے اس فی الحال کی عمر کیا ہوگی؟"

"دس سال۔ پندرہ سال یا شاید۔" وہ آواز میں یقین کی پختگی پیدا کرنے کو پل بھر کے لیے رُکی، پھر بولی۔ "یا شاید تا زندگی۔"

"مگر میں باپ بننے کا بہت خواہشمند ہوں۔ میں گھر میں پھولوں کو تب لگانے کے حق میں ہوں جب ناک میں سونگھنے کی شکتی بھی موجود ہو۔"

"ٹھیک ہے تو پھر بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ وہ تمہیں ماں بنادے۔ مجھے بچے کا باپ کہلوانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"مجھے ایسے مذاق سے سخت نفرت ہے۔" سُندر چڑ کر بولا۔

"میں اپنے پیٹ کو طبلے کی تینوں کی طرح کسا ہوا رکھنا چاہتی ہوں۔ تم اسے ڈھولک بنا دینا چاہتے ہو۔ تو سوچو۔ مجھے تمہارا مذاق اچھا لگتا ہوگا۔" آشا نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

سُندر جھگڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ آشا سے سچا پیار کرتا تھا۔ وہ کچھ دن کے لیے چپ سادھ گیا، مگر پُر خلوص، سچی اور فطرتی خواہشیں کچھ دیر کے لیے دب سکتی ہیں، ختم نہیں ہو سکتیں۔ اس نے نہایت خاموشی سے اپنے اور آشا کے بھلے کے لیے اس کا رازدارانہ طور پر جائزہ لینا شروع کر دیا تو اسے پتہ چلا کہ آشا دکان کا زیادہ وقت باڈی بلڈنگ

سنٹر میں صرف کرتی ہے اور دکان بہت ہی زیادہ گھاٹے میں چل رہی ہے۔ گاہک آتے ہیں اور دکان کو بند پاکر دوسری جگہوں پر اپنی مطلوبہ چیزیں خریدنے چلے جاتے ہیں۔

ادھر آشا نے گھر پر بھی صبح و شام کئی قسم کی ورزشیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ وہ کئی قسم کی ورزشوں مثلاً بیوٹی بریسیٹ، فگر ٹرمر۔ ڈیسٹ شیپر پلان، باڈی شیپر کسرتیں، باڈی بلڈر قسم کے آلات خرید کر ان پر جان مارنے لگ گئی تھی۔ ایک دن وہ ایسا سامان بیچنے والی دکان جو کہ ایک قسم کا باڈی بلڈنگ جمع ہیلتھ سنٹر قسم کی چیز تھا، کے اندر گیا۔ وہاں کئی قسم کے باڈی گارڈ سائیکل تھے، سپرنگ تھے جنھیں کھینچ کھینچ کر بازوؤں کے پٹھے مضبوط کیے جاتے تھے۔ کلائیاں مضبوط کرنے کے مختلف اوزان کے ڈمبل تھے۔ چھت سے لٹکتا ہوا ایک گول کِٹ قسم کا چمڑے کا بیگ تھا جس میں شاید ٹھونس کر روئی بھری ہوئی تھی جس پر ایک عورت انگیہ کچھی پہنے اچھل اچھل کر مکہ بازی کر رہی تھی۔ چھاتیوں کو پتھر بنانے کے سپرنگ تھے۔ جن سے عورت کی خوب صورت، گول اور بھری بھری چھاتیاں دن بدن غائب ہوتی جاتی تھیں اور ان کے ملیامیٹ ہو جانے سے عورت کا نسوانی حُسن تباہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس نے وہاں پہلوان مردوں اور عورتوں کے بڑے بڑے پوسٹر بھی لگے دیکھے۔ مردان تصاویر میں ایسے لگتے تھے جیسے شیر اور چیتے ہوں، ہر وقت لڑنے مرنے اور چیرنے پھاڑنے پر تیار، ان کے چہروں اور آنکھوں میں ایک خوف زدہ کر دینے والی کیفیت ہر وقت طاری رہتی تھی جیسے انھیں دنیا کی ہر چیز کو پیار سے نہیں، مار سے حاصل کرنا ہے، جس میں محبوبہ کے پیار سے لے کر ماں کی ممتا تک سب جذبے شامل تھے۔ ان کے گورو شاید انھیں تصویر کا دوسرا رُخ نہیں دکھاتے تھے کہ بڑے بڑے پہلوان جو بے مقصد جسم کو سانڈ کی طرح بڑھائے جاتے ہیں۔ ان پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ اپنی تمام قوت صرف کر چکے ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں اتنی سکت بھی نہیں رہتی کہ اپنے چہرے پر بیٹھی مکھی تک بھی اڑا سکیں۔ سادہ سا فارمولہ ہے۔ دنیا کی ہر چیز ایک مناسب توازن کے اندر رہتے ہی ٹھیک رہتی ہے مگر اس سے جب بڑھ جائے تو نقصان دہ ہو جاتی ہے۔ ان تصویری پہلوان مردوں کی پنڈلیوں، رانوں، بازوؤں اور کندھوں کی

مچھلیاں پھڑک کر، اچھل کر باہر ٹپک پڑنے کو بے قرار نظر آتی تھیں اور چھاتیوں پر اتنا موٹا غبارے جیسا گوشت جمع ہو گیا تھا کہ محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی انگیہ قسم کی چیز سے اپنی جگہ نہ روکا گیا تو ٹپک کر باہر گر جائے گا۔ اس کے برعکس پہلوان عورتوں کے پوسٹروں میں ان کے بازو ڈھیلا کر اور رانیں اکڑا کر دکھانے کے باوجود ان میں وہ سختی نہیں آسکی تھی۔ صنف نازک کے جسم میں جو ملائمت قدرت نے رکھی ہے وہ چھپتی تو نہیں تھی ہاں مسخ ہو کر اور بگڑ کر ضرور رہ جاتی تھی اور ان کے اوپری جسم پر چھاتی نام کی چیز اتنی سپاٹ ہو گئی محسوس ہوتی تھی کہ صاف نظر آتا تھا جیسے ان کی انگیوں کے نیچے اب ایسا کچھ بھی نہیں رہ گیا جو دوسری صنف کو پاگل کر سکتا ہے۔

آشا نے تین ایسے ہی پوسٹر اپنے بیڈ روم میں پائنتی کی دیوار پر لگائے تھے جن پر رات کو سوتے وقت اور صبح جاگتے وقت بے اختیار نظر پڑ جاتی تھی۔ ایک پوسٹر میں ایک پہلوان ایک بھاری اور موٹی لوہے کی سلاخ میں دو وزنی ڈمبل ٹانگے آدھے دھڑ تک اٹھائے کھڑا تھا۔ بوجھ سے اس کے بازوؤں، ٹانگوں اور جسم کے خاص خاص حصوں کی رگیں اتنی سختی سے تن گئی تھیں کہ رسہ کشی کے وقت جیسا رسے میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے اور لگتا ہے جیسے وہ کسی وقت بھی بیچ میں سے ٹوٹ سکتا ہے۔ پاس ہی دو ادھ ننگی عورتیں بیٹھے ہوئے جن کی اونچائی اس پہلوان کی رانوں تک پہنچتی تھی اس کے جسم کی طرف تعریف کن کم اور بھوکی زیادہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک پوسٹر ایک سیاہ فام پہلوان عورت کا تھا جو صرف ایک چڈی اور انگیہ پہنے، ایک ہاتھ کمر پر رکھے اور دوسرا بازو موڑے اس کے اوپری حصے کی مچھلی دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مچھلی تو اس کے بازو پر کیا بنتی الٹا سارا بازو ہی لوہے کا سیدھی اور سپاٹ سلاخ بن کر رہ گیا تھا۔ دوسری تصویر ایک گوری پہلوان میم کی تھی۔ ورزشوں سے جس کا تمام جسم نسوانی کشش زائل کر چکا تھا۔

یورپ کی آزاد فضاؤں میں کسی کی ذاتیات میں دخل دینا ایک بے انتہا ناجائز عمل سمجھا جاتا ہے۔ چاہے رشتہ میاں بیوی کا ہی کیوں نہ ہو۔ بچے بھی ایک خاص عمر میں پہنچنے کے بعد ایسی تمام بندشوں سے آزاد قرار دئیے جاتے ہیں۔ اور قانون بھی ان کی آزادیوں میں

ان کا محافظ بن جاتا ہے۔ اس لیے آشا کے اس شوق پر وہ بار بار اس کی جواب طلبی نہیں کر سکتا تھا۔ جب کہ وہ ایک دو بار سندر کو صاف لفظوں میں بتا چکی تھی کہ وہ یہ سب صرف صحت مند رہنے کی خاطر کر رہی ہے۔ اس لیے سندر کے پاس بات کرنے کا صرف ایک ہی بہانہ رہ گیا تھا کہ وہ دکان کو گھاٹے میں کیوں چلا رہی ہے اور وہ اس کے فضول قسم کے شغلوں کے لیے اپنی محنت سے کمائی ہوئی تمام پونجی کی بربادی کو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے برداشت نہیں کر سکتا۔

سندر نے سوچا تھا کہ آشا اس مقام پر ضرور کمزور ہوگی مگر وہ بڑی بے فکری اور لاپرواہی سے بولی "دکان نفع میں نہیں تو نقصان میں نہیں جا رہی ہے اور اگر تھوڑا سا انیس بیس کا فرق ہے بھی تو وہ میں جلدی ہی پورا کر دوں گی۔"

"مگر کیسے؟ میں بھی تو جانوں۔"

"بہت ہی سادہ طریقہ ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں اتنے دنوں سے ایک دن بھی نچلی نہیں بیٹھی ہوں۔ یہ سب کچھ جو میں کرتی رہی ہوں، بے مقصد تو نہیں۔ اگر ایک بار بھی تیر نشانے پر لگ گیا تو تمہاری زندگی بھر کی کمائی کے برابر ایک ہی بار کما کر تمہارے ہاتھ پر دھر دوں گی۔"

"ایسا کون سا کیمیا تمہارے ہاتھ لگا ہے۔ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔" سندر نے کہا۔

"میں کام ہو جانے کے بعد ہی کچھ کہنے سننے کے حق میں ہوں مگر تمہاری بے چینیوں کو دیکھ کر کہنا ہی پڑے گا کہ میں ایسے ہی یہ تمام بکھیڑے نہیں کر رہی ہوں۔ باڈی بلڈنگ سنٹر کی میری سہیلی کیتھرین کہتی ہے کہ پہلوان عورتوں اور مردوں کے پوسٹر چھاپنے والا ایک بہت بڑا ادارہ، گوری میموں اور سیاہ فام افریقی پہلوان عورتوں کے پوسٹر تو چھاپ کر اب تک لاکھوں کی تعداد میں فروخت کر چکا ہے۔ اب وہ کسی براؤن رنگ کی ایشیائی پہلوان عورت کا پوسٹر چھاپنا چاہتا ہے۔ میں اسی کے لیے روز و شب تیاریاں کر رہی ہوں۔ میری سہیلی کو سو فی صد یقین ہے کہ وہ اس بار میرا ہی فوٹو اپنے پوسٹر پر شائع کرے گا۔ اگر یہ ہو گیا تو اپنے وارے نیارے ہو جائیں گے کیونکہ ایک پوسٹر کی

رائلٹی ہی ہزار ہا پونڈوں کی صورت میں مجھے حاصل ہو جائے گی۔"

"آشا! میں تمہارا شوہر ہوں۔ تم مجھے مجازی خدا بے شک نہ سمجھو مگر اس ساری دنیا میں تمہارا مجھ سے بڑا خیر خواہ اور کوئی نہ ہوگا۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" آشا نے سُندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بڑی سیدھی بات ہے۔" وہ پل بھر کو رُکا پھر بولا۔ "خدا نے عورت اور مرد کو جُدا جُدا ڈھنگ سے بنایا ہے، مثلاً مرد کسی بھی طرح بچہ پیدا نہیں کر سکتا اسی طرح عورت بھی کچھ کاموں کے کرنے سے لاچار ہے تو کیوں نہ ہر صنف اپنے اپنے ہی دائرے میں خود کو منوائے۔ اسی میں اس کی شان اور حُسن ہے، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب عورت کے پاس ایسا گُن ہے جسے ہر انسان اور دیوتا تک بھی سلام کرتے ہیں تو وہ مرد بن کر کیا کمال دکھانا چاہتی ہے۔"

آشا زور سے ہنسی اور بولی۔ "تو آپ کو میرے سیکس کے بدل جانے کا کہاں سے گمان ہو گیا۔"

"عورت، عورت ہی کی طرح رہے تو بہت اچھی لگتی ہے۔"

"یوں کہو تم عورت کو دبا کر رکھنا چاہتے ہو۔"

"اگر اس کے عورت پن کی عظمت کو تسلیم کرنے سے اس کی کسی غلامی کا پہلو نکلتا ہے تو یہ میرے لیے انتہائی حیرانی کی بات ہے۔"

"زیورات سے لدی پھندی عورت مجھے تو مرد کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی باندی محسوس ہوتی ہے۔ مرد نے اس کا دل بہلانے کو لوہے کی بجائے سونے چاندی کی زنجیروں سے جکڑنا شروع کر دیا ہے، اور نام ان کا رکھ دیا ہے "زیورات"۔" آشا نے لفظ زیورات کو جیسے چڑاتے ہوئے کہا۔ "اور چولہا چوکا ایک قسم کی قید بامشقت ہے، جسے تم لوگوں نے گھر گرہستی کا خوب صورت نام دے رکھا ہے۔"

سُندر بولا۔ "ایک آدھ زیور مرد یا عورت کے حُسن کو دوبالا ہی کرتا ہے۔ یہ زیور

مرد کی کلائی پر ایک سادہ سی گھڑی بھی ہو سکتا ہے اور عورت کی انگلی میں انگوٹھی اور ناک میں لونگ۔ اسی طرح ۔۔۔۔۔"

"بہتر ہے ناک میں نکیل ہی کہہ دیتے۔" آشا نے سُندر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جس کی رسی مرد کی انگلی پر لپٹی رہے اور وہ تابعدار اونٹنی کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہے۔"

"شاباش ہے تم پر ـــ وومن لب (Women Lib) سے تم نے یہی سبق حاصل کیا ہے۔ کیا تمہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کی ضرورت ہیں اور اس ضرورت کو تسلیم کرنے میں کسی کی ہیٹی نہیں۔ اگر مرد اس ضرورت کا احترام نہیں کرتا تو اس کا یہ علاج نہیں کہ اس ضرورت کا ہی قلع قمع کر دیا جائے، اس طرح تو عورت اپنے آپ پر ہی ظلم کرے گی۔"

"کیسے۔"

"آج کی عورت یہ جو مرد کا چولا پہن رہی ہے۔ یہ اس کے جسم کے لیے بنایا ہی نہیں گیا۔ اس لیے یہ اس پر جچتا ہی نہیں۔ اس طرح وہ مرد کے لیے اپنی کشش دن بدن کھوتی جائے گی۔ جس طرح مرد عورت کی طرح بل کھا کر نسوانی اداؤں سے چلنے لگے تو کسی بھی عورت کو بھلا نہیں لگے گا۔"

"بات تو وہی ہوئی کہ عورت مرد کے لیے بنا ٹھنا کرے۔" آشا بولی۔

"نہیں بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ تم مجھے وہ دیا کرو جو میرے پاس نہیں ہے اور میں تمہیں وہ دوں جو تمہارے پاس نہیں ہے تو ہم زیادہ دیر قریب رہ سکیں گے۔"

"آپ ایک ہی بات کو لفظوں کے نئے جامے پہنا کر دہرا رہے ہیں۔"

"نہیں۔ میں ۔۔۔۔۔"

سُندر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ آشا نے اس کی طرف پیٹھ موڑ لی۔ "پلیز بند کیجیے۔ مجھے نیند آ رہی ہے، صبح مجھے بہت سے کام ہیں۔"

اور دوسرے دن سے آشا اور بھی زیادہ بدل چکی تھی۔ اس نے وہ ساون کی گھٹاؤں جیسے کالے اور آبشاروں جیسے لمبے بال کٹوا کر اتنے چھوٹے کروا دیے تھے کہ اس

کا سر ایک کدو کی طرح نکل آیا تھا اور گردن جو کل تک صراحی دار لگتی تھی، بالوں کے ہٹ جانے سے بے ترتیب سی اونٹنی کی سی گردن بن گئی تھی۔ کانوں سے اوپر دور تک اس کے بال اتنے ہلکے کر دیئے گئے تھے کہ بس ایک سرمئی لکیر لگتے تھے اور پر سر کی چھت پر دو رنگوں میں رنگے بال آوارہ جنگلی گھاس کی طرح ہر وقت کھڑے اور تنے رہتے تھے۔ یہ سُندر کے سینے پر زبردست لگہ تھا۔ آشا کے کپڑے بھی اب ایسے ہوتے جا رہے تھے جیسے آوارہ ہپیوں کے ہوتے ہیں اس بے راہ روی میں جانے اسے کیا راحت ملتی تھی کہ وہ دن بدن اپنے قدرتی حسن کو مسخ کرتی جا رہی تھی۔ یورپ میں مرد دن بدن ڈھنپ رہا تھا اور عورت ننگی ہو رہی تھی جیسے کہتی ہو۔ کر لو، میرا کیا کر وگے اور بے بس مرد شرم سے خود ہی پردہ نشیں ہوتا جاتا تھا۔ مشرق سے آنے والی عورت پر بھی آہستہ آہستہ یہ رنگ چڑھ رہا تھا۔ تعلیم نسواں اور آزادی نسواں ایک اچھی بات تھی۔ اس کے لیے مشرق میں بھی جائز سوچوں والا مرد ایک عرصہ سے کئی جنگیں لڑ رہا ہے۔ خود سُندر ذہنی طور پر اور کالج کے زمانے میں عورتوں کی تعلیم اور حقوق کے لیے لڑتا رہا تھا مگر یہ کچھ عجیب قسم کی نئی جنگ شروع ہوئی تھی جس میں وہ عورت کے شانہ بشانہ کھڑا ہو کر اس کے لیے لڑ نہیں سکتا تھا۔

سُندر جسمانی طور پر اب بھی خوب صورت اور توانا مرد نظر آتا تھا۔ اس نے کبھی بھی بازو پھیلا کر، یا ہاتھ اٹھا کر آشا پر اپنی مردانگی کا رعب نہیں ڈالا تھا۔ عورت پر ہاتھ اٹھانے کو وہ انتہائی کمینگی سمجھتا تھا۔ پھر نہ جانے وہ کس احساس کمتری سے دن بدن اپنے ہی اندر ایک موت مرتی رہتی تھی۔ سُندر سوچ سوچ کر تھک گیا تھا مگر اسے آشا کے پاگل پن کا کوئی علاج نظر نہیں آتا تھا۔ آشا کے پاؤں میں اب مردوں کے سے جوتے اکثر میں نیلی جینز یا ضرورت کے مطابق نیکر اور اوپر جیکٹ ہوتی۔ وہ دوڑیں لگاتی۔ سائیکلنگ کرتی۔ مردانہ قسم کی اچھل کود اور کھیلیں کھیلتی اور سخت جسم توڑ قسم کی ورزشیں کرتی تھی جو اس کے حسن کو ایک اژدہے کی طرح دن بدن چاٹتی جاتی تھیں۔

اس کے نازک جسم کے ساتھ یہ مظالم اسے تھکا دیتے تھے تو صبح وہ دیر سے اٹھتی تھی اور دکان پر بھی بے قاعدگی سے جانے لگی تھی۔ جب وہ صبح دیر تک بستر نہ چھوڑ دیتی تو

سُندر اٹھتا، کچن میں جاتا، جو کچھ ملتا، زہر مار کرتا اور چابیاں اٹھا کر دکان پر چلا جاتا۔ پہلے پہل تو آشا کو سُندر کا دکان پر جانا بہت عجیب اور کچھ بُرا سا بھی لگا مگر آہستہ آہستہ اس نے خود ہی ہتھیار ڈالنے شروع کر دیئے۔ سوچا اچھا ہی ہے، اس طرح وہ آزادی سے اپنے کام پر توجہ دے سکے گی اور دکھا دے گی کہ ایک عقل مند آدمی تھوڑے سے وقت میں بھی لاکھوں کما لیتا ہے، جب کہ دوسرا ساری زندگی رگڑے کھانے پر بھی دو وقت کی روٹی بھی مہیا نہیں کر سکتا۔

ورزشوں نے آشا کے جسم کو پتھر کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ اور عورتیں بھی اس دوڑ میں اُسکے شانہ بشانہ دوڑ رہی تھیں۔ بڑا زبردست مقابلہ تھا۔ آشا کی کچھ سہیلیاں ایسی بھی پیدا ہو گئی تھیں جو اس کے اس کام کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور اسے شہہ دیتی تھیں۔ آشا ان کے ساتھ کبھی کبھی کچھ میٹنگوں میں بھی چلی جاتی تھی اور اپنے جسم کے کمالات دکھاتی تھی۔ اس نے اپنے ان کمالاتِ جسمانی کا ایک فوٹو البم بھی بنا لیا تھا جو وہ خاص خاص موقعوں پر دکھا دکھا کر عورتوں کی محفلوں اور کلبوں میں داد وصول کرتی تھی۔ ایسی عورتیں ایک دوسرے کو اپنے گھروں میں بلاتی تھیں، کھاتی پیتی، ہنسی مخول کرتی اور مردوں کا، مردوں جیسا مذاق اڑاتی تھیں۔ ایسی عورتیں جو کسی اونچی پوسٹ پر پہنچ گئی تھیں۔ اپنے ماتحت مردوں کو دبا کر رکھنے، ان کی بے عزتی کرنے، یا سختی سے پیش آنے میں اپنی شان سمجھتی تھیں۔

ایک اچھی پڑھی لکھی اور آزاد خیال عورت نہ صرف اپنے لیے بلکہ سماج کے لیے بھی صاف ستھرا ماحول مہیا کر سکتی ہے۔ سُندر کا خیال تھا کہ اس کے لیے مرد کو اس کے ساتھ نرم برتاؤ اور آگے بڑھنے کے مواقع دینے چاہئیں مگر آشا کے ساتھ اس کے نرم رویے نے تو اگھر کا ہی بگاڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کہاں کمزور تھا، وہ سوچتا آشا کیوں اس سے دن بدن دور ہوتی جا رہی تھی۔ کیا مرد کے ناطے اسے قوتِ بازو کا استعمال کرنا چاہیئے اور اس کا ذہن اس خیال سے ہی اسے سخت لعنت ملامت کرنے لگتا۔ اس کے ذہن میں اس مشکل کا حل دور کہیں ٹکا چھپا بیٹھا نظر آتا مگر سامنے نہ

آتا اور اس پر جھنجھلاہٹ طاری ہو جاتی۔ ادھر آشا آئے دن سخت الجھی تاروں کا گچھا بنتی جا رہی تھی۔ سُندر کو لگتا جیسے اس کا ننھا سا بچہ ان تاروں کے گچھوں میں الجھا اس کی طرف ہاتھ بڑھائے روئے جا رہا ہے اور وہ اسے اِس قید سے آزاد کرانے میں بے بس ہے۔

ویسے تو عورت پس ماندہ تیسری دنیا میں بھی اب جگہ جگہ سامنے آنے لگی تھی مگر یورپ میں تو زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبے چھانے لگی تھی۔ مگر عورتوں کے سامان مثلاً کپڑوں، بیوٹی سیلونوں اور بیوٹی ایڈز کی دکانوں پر تو ان کا اجارہ ہو کر رہ گیا تھا اور وہاں وہ بھرپور میک اپ کر کے کھڑی ہوتی تھیں۔ ایسی دکان اور ماحول میں ایک مرد کا کامیاب سیلزمین ہونا مشکل تھا، کچھ عرصہ بعد، کچھ سوچ کر سُندر نے پہلے تو اپنی ہلکی ہلکی خوب صورت فرنچ کٹ داڑھی مونچھ سے نجات حاصل کی۔ اس سے آشا کو ذہنی چوٹ سی لگی۔ اس نے اس کی داڑھی مونچھ کی صفائی پر اعتراض کیا تو وہی چوٹ سُندر کے لیے سامانِ راحت بن گئی۔ اور اسے لگا جیسے اسے ایک نئی راہ سوجھ گئی ہے۔ اس نے پہلے چہرے کی میک اپ کی چیزوں کا استعمال کرنا شروع کیا جنہوں نے ایک مہینے کے اندر اندر اس کے چہرے کی تمام مردانہ سختی کو چوس کر ایک عجیب قسم کی ملائمت دینی شروع کر دی۔ وہ شیو بھی ڈبل ایج جرمن بلیڈ جلٹ سے بنانے لگا جو اس کے چہرے کے تمام بالوں کی گہری جڑوں تک جا کر صفائی کر دیتا تو اس کی داڑھی مونچھوں کا سرمئی رنگ تک بھی معدوم ہو جاتا۔ آشا جتنی اس کی تبدیلیوں پر چڑتی، وہ اُتنا ہی انہیں بڑھاتا جاتا۔ اس نے گالوں پر راؤز لگانا شروع کر دیا تھا اور اوپری گالوں کو ایک لال لگی فارم سے کشمیری سیب جیسا رنگ دینا شروع کر دیا۔ اس نے کانوں میں لمبے لمبے بندے بھی ڈالنے شروع کر دیئے۔ سر کے بال اس کے اتنے بڑھ گئے تھے کہ ماتھے اور آنکھوں پر گرنے سے بچانے کے لیے اسے عورتوں کے خوبصورت رنگ دار چمکیلے سنہری تتلیوں جیسے کلپ لگانے پڑتے۔ اس کے اس رویئے سے عورتیں اسے مذاق کا سامان بنانے اس کی دکان پر زیادہ تعداد میں آنے لگیں۔ یہ مرد ذات کی ایک ایسی شکست تھی جو انہیں ایک قسم کی خوشی

بخشتی تھی۔ اسی بہانے اُس کی دکان کی سیل بھی بڑھنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنے کپڑوں میں عورتوں کے سے رنگ ڈھنگ اپنانے شروع کر دیئے۔ ایک دن آشا نے اسے کانوں میں لمبے لمبے جھمکے پہنے دیکھا تو چڑ کر بولی۔

"یہ کیا تم نے لٹک مٹک سُندری بننا شروع کر دیا ہے۔"

"مجھے تو اچھا لگتا ہے۔" سُندر بولا۔ "میرے اس روپ سے دکان میں سیل بھی کافی بڑھ گئی ہے۔"

"مجھے تمہارے یہ طور طریقے ذرا بھی اچھے نہیں لگتے۔"

"کیوں کیا کمی ہے؟" سُندر نے کمر پہ ہاتھ رکھ کر ایک ادا سے شیشے کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"کوئی اور مرد بھی ایسا کر رہا ہے یا تم ہی نیا چولا بدل رہے ہو۔" آشا نے طنزاً کہا۔

"بہت کر رہے ہیں تمہیں نظر نہیں آتے تو کوئی بات نہیں۔ تماشہ دیکھنے کو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر میں ہی مداری موجود ہے۔"

"مجھے تو اس راہ کے تم ہی پہلے مرد نظر آتے ہو اور بد قسمتی سے تم میرے خاوند ہو۔"

"تو کیا ہوا۔ کسی نے تو پہل کرنی ہی تھی۔ پہلی عورت جس نے مرد کا بہروپ بھرا تھا۔ وہ بھی تو کسی کی بیوی رہی ہو گی۔"

"تو یوں کہو۔ مجھ سے بدلہ لے رہے ہو۔"

"نہیں۔ میں نے کہا ہے نا۔ دکان کی سیل بڑھا رہا ہوں۔ عشق اور بیوپار میں سب کچھ جائز ہے۔"

"خوب۔ تو پھر میرا میکے جانا بھی جائز ہے۔"

سندر نے کندھے اچکائے، جیسے کہتا ہو "تمہاری مرضی۔ یہ ایک پہلوان عورت کو چیلنج تھا۔ وہ دوسرے دن ہی ایر انڈیا کا ٹکٹ خرید لائی اور چوتھے روز دہلی کے لیے پرواز کر گئی ________ تین مہینے کی جدائی نے دونوں کو ایک دوسرے کے لیے اداس کر دیا۔ کوئی غصہ کرنے والا نہ ہو تو کوئی شرارت کس سے کرے۔ سندر پھر

واپس اپنے اصلی روپ کی طرف لوٹنے لگا۔ عین چار ماہ بعد وہ بالکل ویسا ہو گیا، جیسا پہلے کبھی رہا تھا۔ ایک دن اسے آشا کا خط ملا۔ وہ ہفتے بعد لوٹ رہی تھی۔ لفافے میں اس کا تازہ فوٹو بھی تھا۔ خوب صورت ریشمی ساڑھی میں ملبوس، ویسے ہی لمبے اور گھنے بالوں کے ساتھ وہ بالکل ویسی لگ رہی تھی جیسی سُندر نے پہلے روز ایر پورٹ پر دیکھی تھی۔

بہت دیر بعد سُندر پر یہ راز کسی طرح کھل ہی گیا کہ آشا پہلوان عورتوں کے مقابلے میں ہار گئی تھی۔ ہار جیت میں بدل گئی تھی۔

تیری کہانی

میں نہیں جانتا کہ آج صفحۂ قرطاس کاغذی پیرہن پہنے فریاد کناں میرے ہاتھوں میں کیوں ایسے پھڑپھڑا رہا ہے جیسے مرغا قصائی کے ہاتھوں میں چھری دیکھ کر پھڑپھڑاتا اور نکل بھاگنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ میں نے اپنے قلم سے کاغذ کے گورے گورے گلے میں ہمیشہ لفظوں کے خوبصورت موتیوں کے ہار پہنائے ہیں۔ اتنے چمکدار اور دلفریب کہ کاغذ نے خود ہی گلا آگے بڑھا کر انہیں اپنی گردن میں ڈلوایا ہے، مگر آج میرے قلم کے موتی اتنے بے چمک ہیں کہ کاغذ انہیں خوش آمدید کہنے کو تیار نہیں جیسے میں موتیوں کا نہیں، استعمال شدہ زنگ آلود ننگے اُستروں کا ہار اس کے گلے میں ڈالنے جا رہا ہوں یا شاید قلم اور کاغذ دونوں مذکر ....

میری یہ کہانی چار عورتوں کے گرد گھومتی ہے۔ لڑکی شادی کرنے اور ماں بننے کے بعد عورت بن جاتی ہے، مگر یہ چاروں عورتیں شادی شدہ ہونے اور مائیں بن جانے کے بعد بھی اپنے آپ کو لڑکیاں ہی کہتی اور سمجھتی ہیں۔ شاید لڑکی جب بابل کا گھر چھوڑتی ہے تو صرف پیار بھری بانہوں میں ہی عورت بنتی ہے اور جب یہ سب اسے نہیں ملتا یا اس میں خلوص اور سچائی نہیں ہوتی تو وہ ماں بن کر بھی خود کو نامکمل سمجھتی رہتی ہے، کسی ایسے دوسرے درخت کی طرح جس کے تنے پر پیل بناں اس کی رضامندی اور خواہش کے اُگ آتا ہے، اور کبھی کبھی ایسی لڑکی تکمیل کے شوق میں بھٹک بھی جاتی

ہے، مگر ایسا ہوتا بہت ہی کم ہے۔

میں نے یہ کہانی ان چاروں عورتوں کو الگ الگ سنائی ہے اور وہ چاروں ہی شروع سے اخیر تک اسے اپنی ہی کہانی کہتی اور سمجھتی ہیں۔ حالاں کہ میں نے انھیں بالکل الگ الگ دیکھا، سمجھا اور لکھا ہے۔

پہلی لڑکی کا نام شکنتلا ہے اور کالی داس کی افسانوی شکنتلا میں جو گن تھے وہ سب کو معلوم ہیں۔ وہی سب گن اس عورت یا لڑکی، جو بھی آپ اسے کہہ لیں، میں موجود ہیں یعنی وہ تو یقیناً شکنتلا ہے مگر اس کا میاں مٹھو دشینت نہیں۔ میں نے اس کے میاں کے ساتھ مٹھو کا لفظ لگایا ہے مگر سچ یہ ہے کہ وہ ذرا بھی میٹھا نہیں، بلکہ کڑوا اَخ تھو ہے مگر شکنتلا جب اس کے کڑوے پن کا پردہ کرتی ہے تو ہم تم اسے کڑوا کہنے والے یا سماج کی اسٹیج سے اٹھانے والے کون ہو سکتے ہیں۔ ہم تو وہ بے بس قارئین ہیں جو سب سے بڑے کہانی کار اللہ میاں کے اس ولن کردار کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں ورنہ دنیا کی کہانی شاید مکمل نہ ہو پائے۔

شکنتلا کے دشٹ خاوند کو کھاتے ہوئے بھی رونے اور رلانے کی عادت ہے۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ حلوہ بادام میں بھی لال مرچوں کی خیالی مٹھی ڈال لیتا ہے، خود روتا اور شکنتلا کو رلاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، شکنتلا گن دیتی ہے اور خواتینِ مشرق کی طرح اس کے ذہن کی ڈکشنری میں مجازی خدا، پتی پرمیشور، شوہر پرست، پتی ورتا اور چراغِ خانہ وغیرہ الفاظ بھرے ہوئے ہیں مگر ان کے علاوہ جو الفاظ ان کے برعکس ہوتے ہیں، شکنتلا ان سے واقف تک نہیں۔ دراصل اس ہی کی طرح کی ایک عورت نے گھر سے نکالتے وقت اسے مندرجہ بالا الفاظ کے ساتھ رو رو کر اور بھی کئی اسباق پڑھائے تھے۔ بیٹی تم ابلا ہو، معصوم ہو۔ جس گھر میں تمہاری ڈولی جائے۔ یاد رکھنا، وہاں سے ارتھی ہی نکلے۔ مرد تو سچا موتی ہے بیٹی۔ چار چار شادیوں کے بعد بھی ہیرا بنا رہتا ہے۔ عورت بھٹکی تو لٹکی اور پھر تا زندگی کپڑے سنبھالتی سماج کی ڈال پر الٹی ٹنگی رہتی ہے۔

شگفتلا ماں باپ کے گھر سے اکثر باہر جاتی رہتی تھی، پڑھنے لکھنے کے لیے مگر میاں کے گھر سے وہ ارتھی اٹھنے سے پہلے قدم باہر نہیں نکالنا چاہتی تھی۔ ادھر میاں کی زبردست خواہش کہ ارتھی سے بہت پہلے ہر دن کا کم از کم چوتھا حصہ وہ مزدور گھر سے باہر رہا کرے تاکہ اس کی کلرکی کی مختصر آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ چنانچہ مجبوراً شگفتلا دن کا بہت سا حصہ باہر گزارنے لگی۔ بی اے، بی ایڈ شگفتلا ٹیچر بن گئی۔

شادی سے پہلے ہی شگفتلا نے دشینت کو دیکھا تھا۔ وہ شکل سے ہی دُشٹ نظر آتا تھا اور علم کی گاگر سے تو قطرہ تک اس کے چکنے سر پر نہیں ٹک سکا تھا۔ تب شگفتلا نے بہت رسیاں تڑانے کی کوشش کی تھی مگر اس کے ماں باپ، بہن بھائیوں کی عزت کے واسطے آڑے آگئے تھے اور ان سب نے جھوٹے سچے لالچ کی لاٹھیاں گھبو گھبو کر اسے اس مردہ دل کے ساتھ ستی ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی کہ باہر بھیڑیوں سے بھرا جنگل تھا۔

پڑھی لکھی شگفتلا ترقی کی منزلیں طے کرتی آگے بڑھتی گئی اور جاہل دشینت کلرکی کی ڈال پہ ہی آنکھیں میچے، افسروں کی جھڑکیاں سہتا بیٹھا رہا۔ دفتر میں افسر اس پر برستے تو وہ گھر آکر آندھی طوفان بن جاتا۔ شگفتلا خاموش رہتی کہ کوئی کیا کہے گا۔ اس کا علم ہی اس پر سوچوں کے تمام دروازے بند کر دیتا کہ باہر بھی تو بھیڑیوں کا راج تھا۔ مجبوراً اس نے خود کو زیادہ سے زیادہ ـــــ مصروف رکھنا شروع کر دیا۔ ماں بن کر اچھی ٹیچر بن کر، سماج میں رتبہ اور عزت حاصل کر کے اور اس کی یہی سب اچھائیاں کلرک بھودے کو ایسا کھلونا محسوس ہوئیں جس پر کانٹے اگ آئے ہوں اور وہ جسے نہ رکھ سکتا ہو اور نہ پھینک سکتا ہو۔ وہ شگفتلا کو نت گڑے بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تنگ کرتا، لڑتا جھگڑتا گالیاں دیتا اور خود کو اور اسے بھوک ہڑتال کے عذاب سے گذارتا۔ اس پر بھی تسلی نہ ہوتی تو ہر رنگ میں بھنگ ڈالنے کا سامان کرنے لگتا۔ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں اور کلرک میاں غیر حاضر ہیں۔ کتوں بلیوں کو سیر کرانے باہر لے گئے ہیں۔ ہاں انھیں کتے بلیوں سے عشق کی حدوں تک پیار ہو گیا تھا۔ واپس آئے ہیں تو اپنی چھوٹی

سی کمری جسے وہ سٹڈی کہتے تھے اور جہاں وہ کرائم قسم کے رسالے پڑھتے تھے، قلعہ بند ہو گئے ہیں کھینچ کھانچ کر جیسے تیسے باہر لائے گئے ہیں تو اٹا بھری محفل کا مزہ ہی کرکرا کر دیا ہے۔ غمی رونے کا مقام ہے مگر دشینت اپنے یا شکنتلا کے خاندان میں ہر خوشی یا شادی کے موقعہ کو بھی رونے اور رلانے کا اکھاڑہ بنا لیتے ہیں یعنی شکنتلا کے سگے بھائی کی بھی شادی ہو تو کلرک صاحب آنے کا وعدہ کر کے غیر حاضر ہو جائیں گے اور شکنتلا کے ان کے لئے بنوائے گئے خاص الخاص کپڑے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ دوسرے کسی وجہ سے نہ آسکنے والوں کی طرف سے مبارک بادی کے خوبصورت اور رنگین پھولوں والے ٹیلی گرام یا کارڈ آئیں گے اور ان کی طرف سے بر موقعہ خط آئے گا۔

"میں کچھ دوسری ضروری مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکوں گا۔ اس سلسلے میں کسی سفارشی سفیر کو بھجوانے کی ضرورت نہیں۔"

اب شکنتلا کیا کرے۔ اپنے سگے بھائی یا بہن کی شادی سے کیسے غیر حاضر رہے۔ وہ حاضر تو رہے گی مگر ایسے شادی کے موقعہ پر بھی اداس اداس نظر آئے گی۔ شکل کلرک صاحب کی بس ماشاء اللہ ہی ہے اور دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ شکنتلا کیسے ......؟

ہماری کہانی کا دوسرا کردار راج کرنی ہے۔ راج کرنی کا باپ راجہ ضرور تھا مگر گھر کی عورتیں رانیاں نہیں تھیں۔ دراصل راجہ صاحب کو اپنی عیاشیوں سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کہ سلطنت کے اندرونی معاملات کی طرف دھیان دے سکتے۔ راجہ لوگ خود بہادر ہوتے ہیں اور بہادروں کے قدردان بھی۔ بابو کندن لال انہیں بہادر نظر آئے جوان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے تھے۔ راجہ صاحب کو لوگ شیر بہادر کہتے تھے اور شیر کا داماد گیدڑ کیسے ہو سکتا ہے۔

بابو جی گیدڑ نہیں تھے تبھی تو راجہ صاحب کے سامنے اکڑ گئے۔ راجہ صاحب چاہتے تھے کہ پل سے پہلے ان کی کار کو گذرنے دیا جائے مگر بابو جی ڈیوٹی پر کھڑے تھے اور راج انگریز بہادر کا تھا۔ بابو جی نے لال سگنل اپ ہی رکھا۔ بولے۔ پہلے ٹرین پاس ہو گی۔

راجہ صاحب کو Disobey کرنے کا اُن کا حوصلہ راجہ صاحب کے دِل کو بھا گیا
اور جب راجہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں تو اپنی بیٹی کا ہاتھ اور آدھا راج بخش دیا
کرتے ہیں۔ راجہ صاحب بابوجی کو آدھا راج تو نہ بخش سکے کہ ابھی اپنی عیاشیوں
کے ارمان باقی تھے مگر بیٹی ضرور بخش دی۔ بس تب سے راج کرنی اپنے بابل کا گھر چھوڑ
کر اور بابوجی کے گھر آکر، ان کے میلے کپڑے دھو دھو کر اور جھوٹے برتن مانجھ مانجھ کر راج
کر رہی ہے۔ راجہ صاحب خوش ہیں کہ بیٹی شیر کو دی ہے۔ بابوجی خوش ہیں کہ شیر کی
بیٹی بیاہی ہے اور راج کرنی۔۔۔۔۔۔؟

یہ لڑکی تین جوان بچوں کی ماں ہے اور میاں۔ "ایک طرف ہٹو۔ مجھے فرصت
نہیں۔ میں فیملی پلاننگ کر رہا ہوں۔"

فیملی پلاننگ وہ تکونا لال نشان نہیں جو ہر گلی کے موڑ پر، ہر جگہ آپ کو نظر آ جاتا
ہے۔ فیملی پلاننگ ان کی نظر میں چھ "ک" ہیں۔ جن کے بارے وہ اکثر ہر ایک کو بتاتے
رہتے ہیں کہ کپڑے (اچھے اور قیمتی) کوٹھی، کار، کام (بڑھیا شاندار اور ہائی پیمانے کا۔) کبھی
کبھی دوستوں یاروں کے ساتھ کڑوے پانی کا ایک آدھ جام اور اچھی کتابیں ان کے
چھ ککوں کی گنتی میں آتی ہیں۔ پہلی پانچ چیزیں تو شاید آپ کو اچھے Planned گھر کا
تصور دے سکیں یا نہیں مگر اچھی کتابیں آپ کو ضرور پڑھے لکھے گھر کا نقشہ پیش کریں گی۔
مگر اس نقشے میں آپ کو کوئی شوخ رنگ نظر نہیں آئے گا۔ کیوں کہ مجھے 'فرصت نہیں
صاحب' کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ ان سب کتابوں کے پڑھنے پر مغز پچی کرتے
پھریں۔ وہ تو دراصل شیلف سجانے اور رعب ڈالنے کے لیے ہوتی ہیں۔ اور 'فرصت
نہیں صاحب' زیادہ سے زیادہ ان کے فلیپ پڑھ لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اس سے ذرا زیادہ
لمبی چھلانگ لگائی ہوئی تو دیباچہ پڑھ لیا اور زیادہ ہوا تو دیباچہ لکھنے والے سے چار انگل
اور آگے نکل گئے۔ اب آئیے۔ ٹیگور۔ کالی داس، شکسپیئر اور ابسن تک پر بحث کر لیجئے۔
آپ کے پلے کچھ نہیں پڑتا تو آپ کا نصیب مگر مانئے کہ ہم ہر فن مولا ہیں۔

تین جواں بچوں کی ماں اپنے آپ کو لڑکی سمجھتی ہے کیونکہ انہوں نے اسے ابھی تک

ننھی منی گڑیا، کے اپنے سانولے پن تک، اسے آگے سوچنے ہی نہیں دیا۔ اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے "اُدھر بیٹھو۔ ابھی تم بچی ہو" ان کا تکیہ کلام رہا ہے۔ اتنی ننھی منی بچی ماں بن گئی۔ کیسے؟ یہ نہ وہ جانتی ہے اور نہ صاحب جانتے ہیں۔ ہاں جب اس کے اندر ممتا کی ذمہ داری انگڑائی لے کر جاگتی ہے تو وہ ایک پرانی اور تجربہ کار عورت بن جاتی ہے۔ اور اپنی ایک اکلوتی بیٹی کے لیے جس کے اس نے ہاتھ پیلے کرنے ہیں فکرمند ہو جاتی ہے مگر صاحب بہادر کا تعاون ؟ "مجھے فرصت نہیں"۔

اور یہیں بچاری لڑکی جیسی ماں، ماں جیسی لڑکی مار کھا جاتی ہے۔

اپنی چوتھی ہیروئن سے متعارف کرانے سے پہلے میں آپ کو بطور ریکمک اپنی ایک بھید کی بات بتا دوں۔ نجانے یہ سب قلم کاروں کے ساتھ ہوتا ہے یا صرف میرے ساتھ کہ اِدھر میں اپنے کسی کردار کے بارے میں سوچتا ہوں اور اُدھر اس کے متعلق تمام مواد میرے راستوں میں بچھنا شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً میں نے اِدھر اپنے ایک افسانے میں گھوڑے کو شریف، محنت کش، وفادار دوست اور مزدور کی علامت کے طور پر پیش کرنا چاہا تھا اُدھر اُن دنوں میں جہاں جاتا تھا، جدھر دیکھتا تھا، ہر طرف گھوڑے ہی گھوڑے اپنے ہر رنگ میں ہنہناتے نظر آنے لگے تھے۔ کسی دوست کے گھر، کسی رشتہ دار کے ہاں، کسی پارٹی ڈیلس، کسی کتابوں کی دکان پر، کسی اینٹیک شاپ پر یا لائبریری میں، ہر طرف گھوڑوں کے بارے کتابیں، گھوڑوں کے بت، گھوڑوں کی پینٹنگس، گھوڑوں پر مضامین، گھوڑوں پر ماٹوز، گھوڑوں پر فلمیں، (حتیٰ کہ ایک بار ایک پاکستانی دوست اپنے گھر Video پر فلم دکھانے لے گیا تو ہیرو بھی گھوڑا ہی نظر آیا اور منھ سے بے ساختہ نکل گیا، سبحان تیری قدرت)۔ گھوڑوں کی اقسام اور عادات پر کتابیں ہی کتابیں راستہ روکنے لگیں۔ ایک نیا نارویجیئن دوست بنایا تو وہ بھی ہارس ریسنگ کا شوقین نکلا۔ پچھلے سال لاس اینجلس (امریکہ) کی ایک دکان پر کوئی ڈیکوریشن پیس دیکھنے نکلا تو وہاں بھی ایک خوبصورت آبنوسی فریم پر چڑھتے سورج کے پس منظر کے ساتھ پانچ چھ دوڑتے گھوڑوں کے دلکش پیس نے متوجہ کیا تھا اور اس پر لکھی چند سطروں نے تو قدم ہی روک لیے تھے۔

May you always find new roads to travel
New horizons to explore ....
New Dreams to call your own

میں خود بھی تو ایک گھوڑا ہوں جو وہاں
سے اپنے دکھوں سے بھاگا سات سمندر پار اِدھر اتنی دور نئی راہیں کھوجنے نکلا ہے، نئے افق
تلاش کرنے چلا ہے اور نئے خوابوں کی تکمیل کا خواہاں ہے۔
اب جو اِن عورتوں کی کہانی کہنے کا خیال آیا ہے تو کتابوں سے بھرے شیلفوں سے
ایک کتاب A-Z of Men آنکھیں مارنے لگی ہے۔ ادیب مجھے بھی پڑھ لو۔ میں
نے اسے اتار لیا ہے۔ "مرد ہمیں ہنساتے ہیں، رلاتے ہیں۔ ہم ان سے نفرت کرتی ہیں، پیار
کرتی ہیں ان کے ساتھ رہنا مشکل ہے اور ان کے بغیر رہنا بھی مشکل ہے۔ وہ کہتے ہیں
عورتیں ہماری سمجھ سے باہر کی چیز ہیں مگر کیا ہم ان کے متعلق پوری جانکاری رکھتی ہیں؟"
"نپولین: اس میں شک نہیں کہ یہ چھوٹا سا ڈکٹیٹر بلا کا قابل سپاہی تھا مگر
جس قسم کا سلوک اس نے جوزفائن سے روا رکھا وہ یقیناً ثابت کرتا ہے کہ وہ پہلا
فرانسیسی مرد شاونسٹ تھا اور اگر وہ پانسہ پلٹ دیتی تو........
اور ہماری چوتھی لڑکی اسی لئے میں نے اسے ہیروئن کہا ہے کہ اس نے پانسہ
پلٹ کر دکھا دیا ہے۔ وہ ایک ایسے فن کار کو پسند کرتی ہے۔ یاد رکھیے۔ میں نے
صرف پسند کرتی کہا ہے جو انسانیت کا علم بردار ہے اور جنگ سے نفرت کرتا ہے
اور اپنی پینٹنگس کے ذریعہ اپنے امنِ عالم کے پیغام کو دور و نزدیک، جہاں تک اس
کا بس چلتا ہے، پہنچاتا رہتا ہے مگر ہماری ہیروئن کا خاوند اس کی پسند کو ایک آنکھ پسند
نہیں کرتا۔ اور وہ اس کی پسند کو عشق سمجھتا اور مانتا ہے اور یہیں سے ان کا گھر جنگ
کا اکھاڑہ بنتا ہے اور یہ جنگ کئی سال چلتی ہے۔ یہ جوڑا ڈنمارک کی راجدھانی کوپن
ہاگن میں رہتا ہے۔ لڑکی کئی سال بعد اپنے بھانجے کی شادی پر نئی دہلی گئی ہوئی ہے جہاں
اس کے آرٹسٹ دوست کی پینٹنگس کی نمائش بھی لگی ہوئی ہے مگر وہاں اس کا ننھا

سا بچہ پیٹ کی خرابی کی وجہ سے بہت سخت بیمار پڑ گیا ہے اور لگتا ہے جیسے زندگی اور موت کی دوڑ میں موت اس پر فتح پا لے گی۔ اسی وجہ سے وہ اپنے آرٹسٹ دوست سے نہ مل سکی ہے اور نہ ہی اس کی نمائش میں جا سکی ہے۔ اپنے بچے کے ذرا سا ٹھیک ہوتے ہی وہ اسے دامن میں چھپائے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس گوپن ہاگن بھاگ آئی ہے۔ اِدھر اس کا خاوند شک کے انگاروں پر لوٹ پوٹ ہو رہا ہے اس کا خیال ہے کہ وہاں اپنے یار کے ساتھ گلچھرے اڑاتی پھرتی ہے۔ اس کے اس شک کو تقویت پہنچاتی ہے۔ دلی سے ہیروئن کو بھجوائی گئی اس کے دوست کی انعام یافتہ پینٹنگ جس میں طویل و عریض زمین کے گول دائرے پر پٹین ٹینک کی نلکی سے برسائے گئے پانی سے ہر طرف پھول ہی پھول اُگ رہے ہیں اور ساتھ ہی پرانی زنگ آلود توپ پڑی ہے جس کے دہانے پر ایک ننھی منی ابابیل نے گھونسلہ بنا کر انڈے دے رکھے ہیں۔

میاں کو یہ سب کچھ نظر نہیں آتا۔ "تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے۔" وہ گرجتے ہیں۔ "بچے کو مارتی رہی ہو اور خود موجیں اڑاتی رہی ہو۔ اب پیچھے پیچھے تحفے آ رہے ہیں۔ میرا تمہارے ساتھ رہنا مشکل ہے۔"

اطلاعاً عرض ہے کہ ضروری سروس کے عوض گھر ہیروئن کے نام الاٹ شدہ ہے۔ وہ اپنے بچے کو چھاتی سے لگا کر میاں کی آواز سے کئی گنا زیادہ آواز میں چلاتی ہے۔ "اب میرا بھی تمہارے ساتھ رہنا مشکل ہے۔"

اور وہ میز پر سامنے پڑا اس کا شیونگ سیٹ کھڑکی سے باہر پھینک کر چلاتی ہے۔

"گیٹ آوٹ۔ آئی سے گیٹ آوٹ۔"

جلنے کے لئے

کل ہی اپنے باپ کے پھول گنگا میا کے حوالے کرنے کے بعد اندر لکھنؤ لوٹا تھا۔ اُداسی کی ایک پتلی سی لکیر اس کے دل کو "اگ کمڑا" کی باریک تاروں کی طرح آڑے ترچھے زاویوں سے کاٹتی پھرتی تھی۔ اگر ایک ذرا سی یہ خوشی ساتھ نہ دے رہی ہوتی کہ مرنے سے پہلے اس نے باپ کے آخری درشن کر لیے تھے۔ ان کی ارتھی کو کندھا دیا تھا، اور چتا کو اپنے ہاتھوں آگ دکھائی تھی تو شاید اسے بھی ہارٹ اٹیک ہو جاتا۔ اس کے عین موقعہ پر پہنچ جانے سے اس کے باپ کے چہرے پر جو سکون کی لہر نظر آئی تھی۔ اس نے غم برداشت کرنے کی اسے بھرپور طاقت بخش دی تھی۔

چند تسلی آمیز لفظوں کے لالچ میں اب وہ انکل شام کے سامنے بیٹھا تھا مگر انکل کے پاس بھی جیسے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا ورنہ وہ شاید اتنا عرصہ باہر رہنے اور سوچوں کا انداز بدل جانے کے باوجود اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکتا اور ان کے آفس میں ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔

بہت دیر بعد انکل بولے۔ "تمہارے والد بہت اچھے انسان تھے خوش رہنا اور خوش رکھنا جانتے تھے۔" اس کے بعد پھر کچھ دیر کے لیے طویل خاموشی چھائی رہی۔

"تمہاری ممّی کے مرنے کے بعد غم کے اتنے بڑے گوردھن کو وہ بھگوان کرشن

کی طرح صرف ایک انگلی پر سہار گئے۔"

وہ خاموش رہا شاید اندر اٹھتے طوفان پر بندھ باندھنے کی کوشش کر رہا تھا اور انکل شاید کسی آگے کہنے والی بات کی اندر ہی اندر تمہید باندھ رہے تھے۔

"بچے اتنی دُور دنیا کے دو مختلف کونوں پر، بیوی دس سال سے آنکھوں سے اوجھل، وہ اور کرتے بھی کیا۔ پہلے پانچ سال وہ خود باہر رہے۔ بچے سٹیل کیے۔ واپس آئے تو بیوی نے ساتھ چھوڑ کر پرلوک کی راہ لی۔ فارن سے مجھے اکثر خطوط لکھتے تھے۔"

جب انھوں نے دیکھ لیا کہ اسے باپ کے بارے میں باتیں اچھی لگ رہی تھیں تو وہ بات کو جاری رکھتے ہوئے بولے۔"میں نے تو باقاعدہ ان کے خطوں کی فائل بنوا رکھی ہے۔"

....

"دیکھنا چاہو گے؟" اِندر کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر انھوں نے بیل بجائی۔ سکریٹری نے کیبن کا دروازہ آدھا کھول کر اندر جھانکا تو انھوں نے جیسے آرڈر دیتے ہوئے کہا۔" وہ جگدیش بابو کی فائل تو لانا ذرا۔"

جب تک فائل آتی انھوں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔"بہت ہی خوش طبع اور حُسن پرست تھے۔"

"شاید اسی لیے اتنی بڑی دنیا میں انھوں نے ایسا ملک چنا۔ جہاں جھرنے، جھیلیں، پھول، پہاڑ، قدرتی نظارے اور پانی با افراط تھے۔ قدرتی حُسن سے تو انھیں عشق کی حدوں تک پیار تھا اور نسوانی ......"

"...اور نسوانی حسن بھی ان کی خاص کمزوری تھی۔"

میں تو حیران ہوں انھیں ہارٹ ٹربل کیسے ہوئی۔ اوور ویٹ وہ نہیں تھے، سگریٹ وہ نہیں پیتے تھے، کسی قسم کے فکر اور غم کو نزدیک تک نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ ایسے لوگ اور ہارٹ اٹیک ...... یقین نہیں آتا۔"

فائل آچکی تھی۔ انھوں نے کھول کر اسے اِندر کے سامنے رکھ دیا۔ اوپر اوپر وہ

کاغذ تھا جس پر وہ رقوم درج تھیں جو جگدیش نے باہر جاتے وقت دوستی دوستی میں ان سے بطور مدد لی تھیں۔ بہت معمولی سا میزان، کل پانچ سات ہزار روپے کا تھا۔

اندر کے اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد انھوں نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ "چھوڑو اِسے بے وقوف لڑکی نے جانے اسے کیوں اس فائل میں لگا دیا۔ یہ تو ہمارا دوستانہ معاملہ تھا۔"

اندر فائل دیکھتا رہا۔ انکل شام کے نام اس کے باپ کے خطوط تھے جو دفتری ترتیب سے باقاعدہ نمبر وار اور تاریخ وار فائل کیے گیے ان میں اس کے باپ نے فارن میں اپنی عیاشیوں، سیر سپاٹوں اور معاشقوں کی ڈینگیں ماری تھیں اور شاید یہی دکھانے کے لیے انکل شام نے وہ فائل منگوائی تھی۔ اندر نے سوچا۔ فائل دکھانے کی اور کیا وجہ ہوسکتی تھی۔ یہ دنیا دیوتاؤں کی نگری تو نہیں، اپنے کپڑوں تلے سب ننگے ہیں۔ خود انکل نے ابھی ابھی اپنی سکریٹری کی بلاؤز اور ساڑی کی بیچ ننگی کمر کو کتنی بھوکی نظروں سے دیکھا تھا کہ بیچاری کے کمر ڈھانپتے ڈھانپتے ہاتھوں سے فائل ہی گرنے والی ہو گئی تھی۔ جب اندر نے فائل سرسری طور پر دیکھ کر ایک طرف سرکالی تو وہ بولے۔ "تمہارے ڈیڈی ہر ماحول میں خوشی کا سامان ڈھونڈ لیتے تھے۔ مجھ سے کہتے تھے۔ میرے بچے تو باہر رہتے ہیں۔ مکان تمہیں دے دوں گا۔ تمہاری کمپنی میں نئے نئے لوگ باہر سے آ کر بھرتی ہوتے رہتے ہیں اتنے بڑے شہر میں بیچارے رہائش کے لیے کتنے پریشان ہوتے ہوں گے تم ان کے لیے ایک قسم کا بورڈنگ ہاؤس بنا لینا۔ وہ لوگ جب تک کوئی مناسب ٹھکانہ نہ ڈھونڈ لیں، عارضی طور پر وہیں قیام کریں گے تو میری آتما کو شانتی ملے گی کہ مر کر بھی کچھ مجبور لوگوں کے کام آسکا۔"

اندر خاموش رہا جیسے ایک چپ میں سوکھ تھے مگر انکل خاموش نہ رہ سکے تھوڑی دیر بعد بولے۔ "ڈیڈی نے کوئی وصیت چھوڑی ہے؟"

اندر نے بریف کیس کھولا اور اپنے باپ کی ڈائری ان کے سامنے رکھ دی۔ انکل صفحوں پر صفحے الٹنے لگے۔ آخر ایک صفحے پر رک گیے جس پر ہزاروں ڈالرز کی فہرست تھی

جو انھوں نے اپنے دوست شام کی کمپنی کو فروغ دینے کے سلسلے میں بھیجے تھے۔ انکل کے چہرے پر کئی رنگ آجا رہے تھے۔ آخر بولے۔ "مکان کے بارے میں کچھ لکھا؟"

"صفحہ ستاسی" اندر نے کہا۔

"میری دوستی ہمیشہ کتابوں سے رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد میرے گھر کو ایک چھوٹی سی لائبریری میں منتقل کر دیا جائے، جس کے لیے میری ذاتی کتابوں کا ذخیرہ اور انشورنس کا پیسہ کافی رہے گا۔"

اندر بولا "میں نے مکان کالونی کی کمیٹی کے نام لکھ دیا ہے۔ ادھر فارن میں پاپا کی پنشن کا فیصلہ بھی ہو گیا ہے۔ یہاں اپنے ہی دیش میں پورے اکیس سال انھوں نے اپنی گورنمنٹ کی سروس کی ہے۔ پھوٹی کوڑی تک نہیں ملی۔ خیر چھوڑیئے یہاں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ وہاں سے پانچ سال کی اکھٹی پنشن قریب ایک لاکھ روپے ملے گی۔ لائبریری کے نام فکسڈ ڈیپازٹ کروا دوں گا۔ اس کے سود سے ہی لائبریری کے لیے اخبارات اور رسائل آتے رہیں گے۔"

"تمہارے پاپا تھے بڑے عاشق مزاج میرا مطلب ہے خوش مزاج" اب انکل کی آواز میں سرگوشی نے کچھ اور قسم کی ہو گئی تھی۔

"جی آپ بجا فرماتے ہیں" اندر بولا۔ اور ساتھ ہی اس نے بریف کیس سے ایک اور فائل نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔ "یہ پاپا کے وہ محبت نامے ہیں جو انھوں نے ہندی میں محلے کی ایک خوبصورت عورت سے اپنی کسی آشا نام کی محبوبہ کے نام لکھوائے تھے۔" سب خطوط کاربن کاپی تھے۔

انکل کافی دیر وہ خطوط پڑھتے رہے۔ اندر بولا۔ "یہ خطوط خود مجھے اسی عورت نے دیئے ہیں۔ میں چند ایک ہی پڑھ سکا ہوں۔ مجھے ان کی محبوبہ میں اسی لکھنے والی کے نقوش، زلفیں، باہیں، قد و قامت، چال ڈھال اور سراپا کے ہی خد و خال نظر آئے ہیں۔ شاید وہ اسے ہی دیکھ دیکھ کر اپنی محبوبہ کے حسن کے نقشے کھینچا کرتے تھے۔ محض دیکھ دیکھ کر، ورنہ یہ خطوط وہ خود میرے حوالے ہرگز نہ کرتیں۔ لگتا ہے پاپا اسے اس

ڈکٹیشن لینے کے کام کا اچھا خاصہ معاوضہ بھی ادا کرتے تھے۔ وہ خود ہندی نہیں لکھ سکتے تھے نا۔"

"مگر اس نے یہ خطوط تمہیں کیوں دے دیئے؟" انکل حیران ہو کر بولے۔

"شاید ہمارے گھر کا ایک بھید دے کر کچھ اور زیادہ حاصل کرنے کے لالچ میں۔ اور میں نے چند سکے ادا کر کے اس کا یہ لالچ بھی پورا کر دیا۔"

"مگر وہ یہ خطوط اپنے پاس کیوں رکھتی رہی؟" انکل نے دوسرا سوال کیا۔

"میں نے اس سے یہی سوال کیا تھا۔ وہ بولی، ان کے محبت نامے اس قدر دل پذیر ہوتے تھے کہ میں انھیں پتہ لگے بنا لکھتے وقت نیچے کاربن رکھ کر اپنے لیے بھی ایک ایکسٹرا کاپی بنا لیتی تھی۔"

"اوہ۔ میں کہتا تھا نا کہ مزاج بڑا ہی عاشقانہ رکھتے تھے۔" انکل بولے۔

"انھوں نے سخت محنت کر کے اور غریبی سے اٹھ کر ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔" اِندر نے پہلے ان کے ریمارک کو نظر انداز کیا پھر کہا۔ شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ واقعی ان کا مزاج عاشقانہ تھا۔"

اور ساتھ ہی اِندر نے خطوط کی ایک اور فائل ان کے سامنے رکھ دی جو ان کاربن کاپی خطوط کے اوریجنل تھے۔ دراصل وہ خطوط کہیں پوسٹ ہی نہیں کیے گئے تھے۔

امربیل

ناہید واش بیسن کے سامنے کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی۔ بیسن میں صرف ایک پیالہ جیسے اس کے ذہن کی شریف اور حسین دوشیزہ کو گلی کے غنڈے کی طرح چھیڑ رہا تھا۔ آوازے کسے جا رہا تھا اور وہ سٹپٹا رہی تھی کہ کیا کرے۔ پیالہ اپنے ماتھے پر دے مارے یا اسے سوئے ہوئے منظور کے سر پر توڑ دے۔ یہی ایک پیالہ دھونا باقی رہ گیا تھا، مگر وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس طرح ڈر رہی تھی جیسے بیسن میں پیالہ نہیں سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ اسی واش بیسن میں رات کو ستّر اسّی برتن دھو کر وہ سوئی تھی، جس کی وجہ سے اسے سونے میں دیر بھی ہو گئی تھی۔ اب بیسیوں دوسرے کام اس کے انتظار میں اسے چاروں طرف سے گھیرے کھڑے تھے۔ منظور باتھ روم میں کام پر جانے کے لیے شیو کر رہا تھا۔ اسے منظور کے لیے لنچ تیار کرنا تھا، پھر خود بھی تیار ہونا تھا۔ مگر ذہن کے چھتے میں صبح ہی صبح اس ایک پیالے نے جیسے پتھر مار کر سوچوں کی ہزاروں مکھیوں کو اڑا دیا تھا، جو ادھر ادھر اڑ اڑ کر اور حملہ آور کو کہیں بھی نہ پا کر اپنے ہی غصے میں جل بھن کر واپس آ آ کر چھتے پر ڈنک مارے جا رہی تھیں۔

کل اتوار کی شام کو ان کے ہاں منظور کے بارہ دوستوں کی محفل جمی تھی۔ پہلے ہلکا سا چائے کا دَور چلا تھا جس کے ساتھ بسکٹ، کیک، چپس، ڈرائی فروٹ اور جانے کیا کیا رکھا گیا تھا، انڈین فلم دیکھی گئی تھی۔ بار بار چیزوں کے لئے کچن میں آنے جانے کی

وجہ سے وہ تو فلم اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکی تھی۔ ویسے بھی اسے فلم کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں دیکھنا اچھا نہیں لگتا تھا، کیونکہ کہانی کا دھاگہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا تھا تو ذہن میں اس سے کوئی شکل نہیں بن پاتی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد گپیں مارتے مارتے رات کا ایک بج گیا تھا۔ منظور تو سب کے اٹھتے ہی بستر میں گھس گیا تھا۔ مگر وہ کچن میں بھرے ہوئے داش بیسن کے بوجھ سے آزاد ہو کر سونا چاہتی تھی اس لیے اُسے ڈھائی بجے سے پہلے سونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ صبح کو الارم کے ساتھ ہی اٹھ کر منظور نے اپنے لیے چائے بنائی تھی اور چائے پی کر حاجاتِ ضروری سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کام پر جانے کی تیاری میں جٹ گیا تھا۔ کل کی تھکن سے ناہید کا جسم چور چور ہو رہا تھا اور اسے چائے کی سخت طلب محسوس ہو رہی تھی مگر بستر چھوڑ کر چائے بنانا اسے بہت ہی مشکل کام لگ رہا تھا۔ منظور کے اٹھنے کے ساتھ وہ بھی جاگ گئی تھی اور منظور کی کچن میں چائے بناتے ہوئے ہر قسم کی آوازوں کو سنتی رہی تھی۔ ہر روز پہلے وہی بستر چھوڑا کرتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی ایسی محفلوں کی وجہ سے رات کو دیر ہو جاتی تو منظور اگلی صبح کو اپنے لئے خود ہی چائے بنا لیتا تھا، مگر صرف ایک پیالی، اپنے لیے۔ وہ دن ناہید کے لیے انتہائی کوفت کا دن ہوتا تھا جب کچن سے آتی ہوئی کھڑکھڑاہٹ اس کے دل میں ایک تمنا جگاتی اور حقیقتیں اسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتیں۔ وہ چاہتی کہ صرف اسی دن، کافی عرصہ بعد، بس ایک بار منظور ایک پیالی چائے اس کے لیے بھی بنا دیا کرے اور بستر میں ہی بڑے پیار سے اپنے ہاتھوں سے اسے پیش کیا کرے تو اس کی ساری تھکن اپنی موت آپ مر جائے۔ اس نے پہلے اشارتاً، پھر سر درد کے بہانوں سے اور اس کے بعد صاف لفظوں میں منظور کو اس کی طرف متوجہ بھی کیا تھا، مگر وہ بس اپنے لیے ایک پیالی بنا کر اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ چلڈرن ہوم جانے سے پہلے ناہید کو بہت سے کام کرنے ہوتے تھے، مگر اپنے لیے ایک پیالی چائے بنانا یا منظور کا چھوڑا ہوا جھوٹا کپ دھونا اسے قہر محسوس ہوتا تھا اور وہ اس روز اکثر چائے پیے بغیر ہی کام پر نکل جاتی تھی۔ پھر اسے پہلے سے سر درد نہیں بھی ہوتا تھا تو بعد میں ہو جاتا تھا۔

لاہور میں منظور کی بہن ناظمہ ناہید کی ہم جماعت اور ہم راز سہیلی رہی تھی۔ ایک دن ناظمہ کے پاس ناہید نے ایک خوب صورت نوجوان کی تصویر کی جھلک دیکھی تھی جسے وہ ایک خط کے ساتھ لفافے میں رکھے اپنی کتابوں میں چھپائے پھرتی تھی۔ اس نے ناظمہ سے مذاقاً کہا تھا، ''کوئی چنگاری گرے تو پہلے مجھے ضرور بتا دینا۔ سچ کہتی ہوں مجھ سے زیادہ ہمدرد سارے ملک میں تم اور کوئی نہیں پاؤ گی۔''

ناظمہ ہنستی تھی تو ہنستی ہی چلی جاتی تھی۔ ''پگلی یہ دیکھ''۔ اور اس نے لفافہ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ یہ منظور کی تصویر تھی اور اس کا خط اپنی بہن ناظمہ کے نام۔ خط میں لکھا تھا: ''بہن! یہاں یورپ کی ہوائیں بہت ہی بھٹکانے والی اور نشہ آور ہیں۔ اگر بھٹو صاحب کوہ نور ہیرا حاصل کر چکے ہوں تو اسے چرا کر مجھے بھیج دو۔ فکر نہ کرو۔ مجھے ہیرے سنبھالنا آتا ہے۔ ہیروں کا مجھ جیسا پارکھ ساری دنیا میں اور کوئی نہ ہوگا۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارا چنا ہوا پتھر بھی لاکھوں ہیروں سے بڑھ کر ہوگا۔''

اسے تصویر میں کھویا دیکھ کر ناظمہ نے کہا تھا: ''ارے! میں بھی کہاں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ کوہ نور سے بڑا ہیرا تو اپنے پاس ہی موجود ہے۔''

''کہاں ہے، کون سا؟ ناہید نے چونک کر پوچھا تھا، ''تم لوگ ہیروں، موتیوں اور دولت کے انبار کے بغیر بات ہی نہیں کر سکتے۔ ویسے تمہارے بھائی رہتے کہاں ہیں؟''

''پہلے تو ناروے میں رہتے تھے مگر اب سچ کہہ دوں اے سہیلی گر تو برا نہ مانے'' اس نے ناہید کی ٹھوڑی تلے انگلی رکھ کر اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرارت سے کہا تھا۔ ''اب ان آنکھوں میں رہتے ہیں۔''

''چل ہٹ۔'' ناہید نے مصنوعی غصے سے کہا تھا۔

''میں تو ہٹ جاؤں گی، مگر وہ تمہارے دل جیسی خوب صورت جگہ سے کیوں ہٹنے لگا۔''

پھر ناظمہ نے ناہید کو اپنے بھائی کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا کہ وہ ناروے میں رہتا تھا اور ابھی کنوارا تھا اور وہ اس پر پورا اعتماد بھی رکھتا تھا کہ وہ اس کے لیے کوئی

بہت ہی اچھی بیوی تلاش کر دے گی۔ ناہید کو بھی منظور اپنا آئیڈیل اور خوابوں کا شہزادہ نظر آیا تھا۔ رنگین تصویر اور اس کے خوب صورت پس منظر کے ساتھ تو وہ جادوگر لگتا تھا۔ ناظمہ نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ناروے میں کس پوسٹ پر تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی؟ ناہید نے سوچا تھا کہ آٹھ ہزار ماہانہ تنخواہ پانے والا کوئی معمولی کلرک تھوڑا ہی ہوگا اور اتنی تنخواہ پانے والے کے پاس کار اور کوٹھی کا ہونا تو کوئی اچنبھے کی بات ہی نہیں تھی۔ ناظمہ سے اس کی دوستی ابھی پچھلے سال ہی شروع ہوئی تھی، جب وہ کالج میں نئی نئی داخل ہوئی تھی۔ ناظمہ کی باتوں اور انداز سے ایسا لگتا تھا جیسے ان کے ہاں ابھی کچھ عرصہ پہلے کوئی بہت بڑی تبدیلی آئی ہے۔ ظاہر ہے یہ سب بھائی کے فارن جانے کے بعد ہوا تھا۔ کیوں نہ ہو، اسی سکھ کے لیے ہی تو ماں باپ اولاد چاہتے ہیں۔ اس کی سہیلی کا گھر سدھر رہا تھا تو ایک طرح اچھا ہی تھا۔ کوئی جسے اپنا کہے، اس کے سکھوں سے خوش کیوں نہیں ہوگا؟

اس روز اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس نے خدا سے جنت مانگی ہو اور اسے مل گئی ہو، مرے بغیر۔ اسی دھرتی پر۔ بس صرف دھرتی کا ایک کونا چھوڑ کر دوسرے کونے پر منتقل ہونا تھا۔ مگر یہ تو صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ لڑکیاں کب تک ماں باپ کے گھر بیٹھ سکی ہیں۔ اور جب اس کے خوابوں کا شہزادہ اسے ہوا کے گھوڑے پر سوار کر کے ناروے کے عظیم شہر اوسلو لایا تھا تو اس کا دل ایک شہر گلستاں بنا ہوا تھا، ہنستا مسکراتا، رنگ و نور بکھیرتا۔"

ایرپورٹ پر کسی خاص مشکل کے بغیر وہ باہر آ گئے تھے جہاں منظور نے بتایا تھا۔ "یہ ہیں حامد، میرے دوست، میرے ساتھ کام کرتے ہیں، ہمیں لینے آئے ہیں۔"

جھکی جھکی نظروں سے ناہید نے حامد کے سلام کا جواب دیا تھا۔ ناہید کو حامد کے بے پروائی سے پہنے ہوئے بے ترتیب کپڑوں اور بکھرے ہوئے بالوں سے ایسا لگا تھا جیسے وہ کہیں معمولی چپراسی ہو۔ اس نے سوچا تھا یہ منظور کے دفتر میں چپراسی ہی ہوگا، مگر منظور نے تو اسے دوست ہی بتایا تھا۔ پردیس میں وطن سے اتنی دور تو اپنے دیس

کا کتا بھی پیارا لگتا ہے۔ چپراسی نہیں ہوگا تو زیادہ سے زیادہ جونیر کلرک ہوگا۔ پھر منظور اور حامد نے سارا سامان اٹھا کر باہر کھڑی اسٹیشن ویگن میں رکھ دیا تو ناہید کو پکا یقین ہو گیا کہ وہ منظور کا ڈرائیور ہوگا۔ ناہید کو کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ دو چار دن میں سب باتیں اپنے آپ عیاں ہو جاتی تھیں۔

ویگن شہر کی خوب صورتیوں اور رونقوں سے نکلتی ہوئی ان کے گھر کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ بہت بڑی بلڈنگ تھی، جس میں بہت سے فلیٹ تھے، لفٹ سے وہ لوگ چوتھے فلور پر پہنچے۔ منظور نے گھر کا دروازہ کھولا۔ چھوٹے چھوٹے دو کمرے، ملا جلا ٹائیلٹ باتھ، اور باہر دم گھونٹ دینے والی گیلری میں دو الماریاں۔ کچن تھا ہی نہیں۔ مگر بعد میں جب منظور اپنے، اس کے اور حامد کے لیے چائے بنا کر لایا تو اسے پتہ چلا کہ باہر کہیں کچن بھی تھا۔ شام کو منظور نے اسے کچن بھی دکھا دیا تھا۔ دراصل یہ چار گھروں کا ملا جلا کچن تھا۔ دوسرے دن ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ کوٹھی جس کے اس نے خواب دیکھے تھے، بس یہی چوتھی منزل کی زمین پر بنے ہوئے دو کمروں کا نام تھا۔ اور کار کا تو کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔

آنے کے چوتھے دن بعد ہی منظور کی چھٹی ختم ہو گئی تھی اور وہ کام پر جانے لگا تھا۔ اسے منظور کا یہ کہنا کہ کام پر جانا ہے۔ بڑا عجیب لگتا تھا۔ جانے اسے 'آفس جانا ہے،' کہتے ہوئے کیا دقت پیش آئی تھی۔ بعد میں اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ کسی بڑے دفتر کا بڑا آفیسر نہیں کسی فیکٹری کا معمولی ورکر ہے۔ یہ جان کر اس کے خوابوں کا کچھ مر نکل کر رہ گیا تھا، کیوں کہ اس نے آٹھ ہزار روپے تنخواہ پانے والے کا جو تصور دل میں باندھا تھا، وہ برعکس نکلا تھا، مگر یہ سو فیصد سچ ہی تھا کہ وہ تنخواہ آٹھ ہزار ہی پاتا تھا، کیوں کہ یہاں گلیوں میں صفائی کرنے والے مزدور بھی اتنی تنخواہیں لیتے تھے۔ ایک اس بات کے علاوہ سب کچھ جھوٹے خواب تھے۔ سراب، جن کی طرف وہ پیاسی ہرنی کی طرح بھاگ نکلی تھی۔

کوئی خواب نہ دیکھے تو حقیقتیں جنم کیسے لیں؟ کوئی پہلے خوابوں میں اڑا ہوگا، اس

کے بعد ہی تو ہوائی جہاز بنا۔ بدھ بھکشوؤں نے جنت کے خواب دیکھے اسی لیے تو وہ اجنتا جیسی جنت دھرتی پر بسا سکے۔ جب یہ سچ ہے کہ منظور آٹھ ہزار روپے تنخواہ لیتا ہے تو خوابوں کو حقیقت میں بھی بدلا جا سکتا ہے۔ کشتیاں، جہاز اور پیسے قدموں کے نیچے ہوں تو خوابوں کے شہر بہت دن دور نہیں رہ سکتے۔ منظور تعاون دے تو وہ سب خوابوں کو حقیقتیں بنا کر دکھا دے گی۔

وہ کئی دن کسی ایسے موقعے کے انتظار میں رہی جب اپنے دل کی بات منظور تک پہنچا سکے۔ اور یہ موقع آخر خود ہی اچانک اس کے ہاتھ لگ گیا جب ایک دن منظور نے کہا، "میرے ذہن میں کتنے خواب بستے تھے یہاں فارن آنے سے پہلے۔ مگر اب لگتا ہے جیسے کوئی بھی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔"

"کیوں نہیں ہو گا؟" وہ بولی۔ "اب بھی کیا کمی ہے؟ سب کچھ تو ہے۔"

"تم اسے ہی سب کچھ سمجھتی ہو؟"

"نہیں۔ میرا مطلب ہے جب تمہاری تنخواہ اتنی شاندار ہے تو دل کے سارے ارمان بھی پورے کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی اپنا بزنس شروع کرنے کے بارے میں بھی سوچا جا سکتا ہے صرف تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔"

منظور کے لیے خواب بہت اوپر جگمگانے والے ستارے تھے، جو چمکتے تھے نظر آتے تھے، مگر ہاتھ بڑھاتے ہی گرتے، ٹوٹتے اور نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے، وہ انہیں محض ایک خیالی دنیا تصور کرتا تھا، مگر ناہید ہر بات، ہر خواب کو گرہ سے باندھ لیتی تھی۔

وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں شام کو نارویجین زبان سیکھنے لگی۔ مشترکہ کچن میں چاروں گھروں کا مشترکہ اخبار آتا تھا، جس میں وہ کم از کم خبروں کی سرخیاں اور نئی نئی چیزوں کے اشتہارات ضرور دیکھ اور کام چلانے لائق سمجھ لیتی تھی۔ ان ہی اشتہارات کی مدد سے اس نے بازار میں ضرورت کی کئی چیزیں ''سیل'' میں سستے داموں میں حاصل کی تھیں۔ عورت میں گھر کے بنانے کی صلاحیت بچپن ہی سے ہوتی

ہے۔ اخبار میں ٹورسٹ کمپنیوں کے دوسرے ممالک کی سیر کے پروگرام بھی ہوتے تھے آہستہ آہستہ ناہید کو بھی علم ہوتا گیا کہ کوئی خبر رکھے تو ان میں کئی پروگرام بہت کم قیمت کے بھی ہوتے ہیں۔ جب آخری دنوں میں کمپنی کے پاس صرف دو چار سیٹیں خالی رہ جاتی ہیں اور جہاز اڑنے والا ہوتا ہے تو دو تین دن پہلے تمام سہولتوں کے ساتھ وہی پروگرام آدھی سے بھی کم قیمت پر دستیاب ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی ایک پروگرام سے ایک دن اس نے منظور کو مطلع کیا تو وہ ہنس کر بولا۔
"تم کہاں پیسے کی دشمن میرے گھر آ گئی ہو؟"

"دیکھو منظور، پیسہ تو یہاں بات کرنے پر بھی خرچ ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم پیرس دیکھنا چاہتے ہیں؟ اگر تمہارا جواب 'ہاں' ہے تو یہ پروگرام ریل کے ٹکٹ سے بھی آدھا پڑ رہا ہے۔ ہوٹل، ٹورسٹ بس، بریک فاسٹ بھی اسی قیمت میں شامل ہیں۔"

"تم نے اوسلو دیکھا ہے؟" منظور نے پوچھا۔
"نہیں، تم نے دکھایا ہی نہیں۔" ناہید نے کہا۔

"تو پہلے اوسلو دیکھو۔ تم جانتی ہو میں تو صبح شام کام کرتا ہوں، تم دن بھر گھر میں پڑی رہتی ہو۔ لگے ہاتھوں اوسلو ہی دیکھ ڈالو۔ ناروے کی راجدھانی یہ شہر بھی خوب صورت اور قابل دید ہے۔"

"شکریہ۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ مونہہ پر کہتی تو اس کی تلخی اور کاٹ منظور کو بھی نظر آ جاتی۔

کچھ دن بعد پھر اخبار کا ایک صفحہ سامنے رکھ کر اس نے منظور سے کہا۔ "منظور، لندن کا یہ ٹور بالکل مٹی کے مول ہے۔ تم ابھی فون کر دو ورنہ بک ہو جائے گا۔"

"ہو جانے دو۔ مجھے فرصت نہیں۔"

"یہ تو صرف ویک اینڈ کا پروگرام ہے۔"

"ہفتہ بھر کی رگڑائی کے بعد یہی تو چند گھنٹے آرام کے ملتے ہیں۔ تم ان کو بھی

ان فضولیات میں ضائع کرنا چاہتی ہو۔"

"مگر ان دنوں میں بھی تو تم دوستوں کی کوئی نہ کوئی دعوت رکھ لیتے ہو۔ وہ بھی تو ایک قسم کی فضول خرچی ہی ہوتی ہے۔" وہ بولی۔

"میں اتنا پاگل نہیں چار دعوتیں دیتا ہوں تو پانچ ان سے کھاتا بھی ہوں یہی میری سیر اور یہی میری تفریح ہے۔"

"یہ تو بزنس ہو گیا۔ ہابی کہاں رہی؟" ناہید نے کہا۔

"ناہید، یاد رکھنا، میں تمہیں نارویجین شہریت کبھی نہیں لینے دوں گا۔ تمہاری ابھی سے یہ حالت ہے تو پاسپورٹ بدلنے کے بعد مجھے تگنی کا ناچ نچاؤ گی۔" منظور بولا۔

"واہ رے تمہاری ہابی!" ناہید نے دل میں سوچا۔ "دونوں صورتوں میں عورت ہی پستی رہتی ہے۔ یہاں میں، وہاں ان کی بیویاں۔ دس دس آدمیوں کا کھانا پکاؤ اور رات کے دو دو بجے تک برتن دھوتے رہو۔"

نارویجین شہریت سے مجھے بھی کوئی دلچسپی نہیں، مگر وقت کو اچھے ڈھنگ سے گزارنے کا انسان کے پاس کوئی مثبت شغل تو ہونا چاہئے۔"

"پیسے برباد کرنے کا نام تم نے مثبت شغل رکھ دیا ہے، ہاں اللہ توفیق دے تو میں کسی نیک کام میں پیسہ لگانے میں دریغ نہیں کروں گا۔"

ناہید کے پاس نیک کام کا بھی ایک پروگرام تھا۔ مگر یہ موقع کہنے کا نہیں تھا۔ مناسب وقت دیکھ کر اس نے ایک دن منظور سے کہا، "منظور، وطن میں ہمارے محلے میں ایک بیوہ رہتی ہے۔ اس کا ایک ہی لڑکا ہے، جس سے اس کی مستقبل کی تمام امیدیں وابستہ ہیں۔ ہم اگر ہر ماہ چند سکول سے اس کی مدد کر دیا کریں تو اس کے تمام خواب پورے ہو سکتے ہیں۔"

"کل کو تم اپنے محلے میں میری کمائی سے اپنے ماں باپ کو محل بنا کر دینا چاہو گی۔"

ناہید صبر کی پتلی تھی، مگر ماں باپ کے بارے میں ہر لڑکی جذباتی ہو جاتی ہے۔ تڑپ کر بولی، "منظور، کان کھول کر سن لو، تمہاری تو کیا میں اپنی کمائی سے بھی انہیں ایک

جھونپڑی تک بنا کر نہیں دوں گی۔ ویسے تم نے خود بھی دیکھ لیا ہے کہ ان کے پاس رہنے کو مناسب ٹھکانہ ہے اور شاندار پنشن اور اس سے زیادہ کی انھیں خواہش بھی نہیں۔ میں تو تمہارے محلے کی ایک غریب عورت کی بات کر رہی تھی۔"

"تو تم چاہتی ہو کہ میں سات سمندر پار اس یخ بستہ ملک میں کما کما کر غریبوں کے لیے خیرات خانہ کھول لوں۔"

"بالکل نہیں۔ تمہاری محنت کی کمائی پر تمہارا اپنا حق ہونا چاہیئے۔" وہ بولی۔ "میں تو اس پیسے کی بات کر رہی ہوں۔ جو تم کسی قسم کی مزید محنت کے بغیر شام کے ہوٹل جاب میں ٹپ کی صورت میں کماتے ہو۔ تم دونوں تنخواہیں بخوشی اپنی جیب میں رکھا کرو، مگر اپنی ٹپ کا دسواں حصہ بھی اگر اسے ماہانہ بھیجتے جاؤ تو اس غریب بچے کی زندگی سنور جائے گی۔"

"دیکھو ناہید، میں تمہاری یہ فضول خرچیاں اور شوخیاں پسند نہیں کرتا۔ میں Charity Beginsat Home کا قائل ہوں۔"

"گھر کی یہ چیریٹی سے ہی تو بات شروع ہوئی تھی۔ کیا میں گھر کی ممبر نہیں کہ ذرا سی سیر کو بھی راضی نہیں ہوتے۔ بس لا کر قیدی بنا کر رکھ دیا ہے۔ ناہید نے سوچا، مگر اس کی زبان خاموش رہی۔ کیا فائدہ؟ وہاں تو چکنے گھڑے والا معاملہ تھا۔

کچھ عرصہ بعد پھر ایک روز بات چل نکلی کہ ایسی باتیں زندگی بھر ساتھ رہنے والوں میں ہوتی رہتی ہیں۔

"تمہیں پارٹیاں دینے کا شوق ہے۔ یہ جگہ تنگ پڑتی ہے میں سوچ رہی تھی کہ ہمیں اپنا ایک مناسب سا گھر بنانا چاہیے۔" ایک دن ناہید نے کہا۔

"کیوں؟ اس گھر میں کیا کمی ہے؟ اور بھی تو لوگ یہاں رہتے ہیں۔" منظور بولا۔

"سب ہی طالب علم قسم کے لوگ ہیں۔" ناہید نے کہا۔ "مجھے تو یہ گھر کم، بورڈنگ ہاؤس زیادہ محسوس ہوتا ہے۔"

"یہاں گھر بنانا کیا اتنا آسان ہے۔؟"

"ہاں۔ یہاں تو بہت ہی آسان ہے۔ گورنمنٹ بنے بنائے مکان دیتی ہے، ساتھ

سستے سود پر قرض بھی مہیا کرتی ہے۔"

"قرض پر بھی ڈھیروں پیسہ ختم کرنا پڑتا ہے۔"

"گھروں کے لیے ہر جگہ ڈھیروں پیسہ لگتا ہے، پھر بھی لوگ گھر بناتے ہیں، پرندے تک گھونسلے بنا کر رہتے ہیں۔"

پھر ناہید نے خود ہی جا کر مکان دلانے والے دو تین سرکاری اداروں اور ایک دو پرائیویٹ کمپنیوں میں اپنا نام درج کرا دیا اور اخباروں میں بھی مکانوں کے فروخت کے اشتہارات دیکھنے لگی۔ منظور کو ناروے آئے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے۔ پانچ سال پہلے نارویجین سرکار نے مکانوں کی کمی کی وجہ سے کام کے لیے آنے والے تارکین وطن کی آمد پر پابندی لگائی تھی، اس لیے وہ ان تارکین وطن کی آبادکاری کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھی۔ جو آ چکے تھے انھیں جلد ہی ایک نئی کالونی میں مکان الاٹ ہو گیا۔ کچھ اڈوانس رقم ادا کرنی تھی اور ماہانہ کرایہ۔ اور اسی کرائے کے ایک حصہ کو پندرہ سال بعد مکان کی قیمت میں شامل کر کے تھوڑے بہت لین دین کے بعد انھیں ملکیت حاصل ہو جاتی تھی۔ ناہید کسی نہ کسی طرح منظور کو منا کر مکان دکھانے لے گئی۔ بہت ہی خوب صورت پہاڑی کی وادی میں خوب صورت سی نئی کالونی تھی۔ ان کا مکان تو بہت ہی خوبصورت جگہ پر واقع تھا۔ دو بیڈروم، ڈرائنگ روم، چھوٹا سا اسٹور، کچن، اور ٹائیلٹ، کم باتھ پیچھے گیلری سے نیچے وادی کا نظارہ بہت ہی دل کش تھا۔

"اتنا بڑا محل کیسے لے سکیں گے۔ کرایہ تو دیکھو ڈھائی ہزار ماہانہ۔ اُف! میری تو سنتے ہی جان نکلی جا رہی ہے۔" منظور بولا۔

"یہ محل نہیں، عام سا مکان ہی ہے۔ دو ہی تو کمرے ہیں۔ ایک ہمارا سلیپنگ روم، ایک ریڈنگ روم یا مہمانوں کا کمرہ۔ یا پھر اسے بے بی کا کمرہ بنا لیں گے۔ جیسا تم چاہو گے۔"

"بے بی؟" منظور نے ناہید کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا رنگ تھا جسے خوشی بھی سمجھا جا سکتا تھا، حیرانی بھی۔

"ہاں مجھے کچھ دن اوپر ہو گئے ہیں۔" ناہید نے شرما کر بتایا۔

"ایڈوانس کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے ؟" منظور نے سوال کیا۔

"بینک میں پڑے ہوئے تمہارے پیسے اور کس کام آئیں گے۔ ان پر تین گنا قرض مل جائے گا۔" اس سے پہلے کہ اپنے پیسوں کے ذکر سے ہی منظور گھبرا جائے ناہید بولی "میرے پیسے بھی تو تمہارے ہی ہیں تم سارے دن اور پھر شام کو بھی کام کرتے ہو۔ دل بہلانے کے لیے پچھلے سات ماہ سے میں پڑوس کے چلڈرن ہوم میں چار گھنٹے کام کر آتی ہوں۔ وہی پیسے بینک میں جمع ہیں۔ رہا کرایہ، تو وہ تو ایک طرح قیمت میں ہی ایڈجسٹ ہوتا جائے گا۔"

"مگر ......"

"اب تم کچھ نہ کہنا۔ میں نئے مہمان کا اس کبوتر خانے میں سواگت ہرگز نہیں کروں گی۔"

مکان لے لینا تو جیسے بس ایک کھیل تھا جو شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہو گیا۔ کچھ کاموں کا آغاز آسان ہوتا ہے، انجام خوب صورت، مگر بیچ کا دور محنت طلب اور خرچیلا۔ کچھ ایسا ہی گھر بنانے کا سلسلہ ہے۔ خالی مکان کو بھرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ گھر ایک ایسا کنواں ہے جس میں جتنا ڈالتے جاؤ، کم ہے۔ انھیں کھڑکیوں اور دروازوں کے لیے پردے خریدنے تھے، فرش کے لیے غالیچے، سلیپنگ روم کے لیے ڈبل بیڈ، دوسرے کمرے کے لیے میز، کرسیاں، ریک، اور ایک صوفہ کم بیڈ، کچن کے لیے فریج، واشنگ مشین، ڈرائنگ روم کے لیے الماریاں، کشن، صوفہ سیٹ اور ایک طرف ڈائننگ ٹیبل اور نیا گھر ہو تو ایک رنگین ٹی وی بھی ہونا چاہیئے۔ اب تک تو کباڑی مارکیٹ سے خریدے ہوئے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی ہی سے کام چل رہا تھا۔ منظور سامان کی فہرست کی طرف دیکھتا تو اسے ہول اٹھتا کہ یہ سب کہاں سے آئے گا۔ خالی گھر کی طرف دیکھتا تو وہ اسے بھوتوں کا مسکن محسوس ہوتا۔ مگر ناہید نہ صرف مکان کے سجانے سنوارنے کے معاملے میں حوصلہ مند تھی، بلکہ خرچ کرنے میں بھی منظور سے پیش پیش رہی تھی۔ گھر کے معاملے میں عورت زیادہ جذباتی ہوتی ہے۔ شاید عورت شادی بھی اپنے گھر اور بعد میں اس میں بھر جانے والی کلکاریوں کے لالچ سے ہی کرتی ہے۔

جب چیزیں خریدتے خریدتے اور انھیں مناسب جگہوں پر سیٹ کرتے کرتے وہ تھک

گئے تو ناہید ایک رنگین ٹی وی بھی لے آئی۔ منظور ٹی وی کو دیکھ کر بھڑک ہی تو اٹھا "ابھی اس کی ضرورت تھی؟"

"اس کی تو سب سے پہلے ضرورت تھی اتنا کام کرتے ہیں، تھک جاتے ہیں، کوئی تفریح کا سامان بھی تو ہونا چاہیئے۔" ناہید بولی۔

"اور وہ جو پہلے پڑا ہے۔"

"پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ کباڑی بازار سے آیا تھا، وہیں واپس دے آئی ہوں۔ چار پیسے بھی مل گئے ہیں۔" ناہید ہنس پڑی۔ اس کی مسکراہٹ اتنی دل پذیر تھی کہ کوئی بھی سب کچھ بھول کر اس کے لبوں کے حسن کی طرف مائل ہو جاتا، مگر منظور پر جیسے کچھ اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ ناہید اسے پیسے کی دشمن محسوس ہوتی تھی۔

....

گھر بھرتا گیا، بینک کی پاس بکیں خالی ہوتی گئیں اور اندر اندر منظور کی صحت کو بھی گھن لگتا گیا۔ اسے اس طرح کے وحشت خیز خواب دکھائی دیتے کہ وہ ایک ہلکا پھلکا، خزاں زدہ پتہ ہو گیا ہے جسے ہوائیں اِدھر اُدھر اڑائے پھرتی ہیں اور خود پر اس کا کوئی اختیار ہی نہیں۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اسے لگتا جیسے کوئی ٹرک یا موٹر اپنا راستہ چھوڑ کر اسے کچلنے کو دوڑ پڑے گا یا اپنی کمزوری کی وجہ سے وہ خود ہی اس کے پہیوں کی لپیٹ میں آجائے گا۔ کوئی اونچی آواز سے بات کرتا تو اس کا دل دہل جاتا۔ ان کے گھر کے قریب ہی ایک مشین سے ایک پہاڑی کو کاٹا جا رہا تھا جب مشین ٹھک ٹھک کی آواز سے پتھریلی چٹانوں میں لوہے کی سلاخیں گاڑتی، انھیں کاٹتی چیرتی تو منظور کو ایسا لگتا جیسے وہ سلاخ اس کے سینے میں گھونپی جا رہی ہے۔

گھر کا بہت سا کام مکمل ہو چکا تھا، جو باقی تھا اسے بیچ میں چھوڑ کر ناہید اسے ڈاکٹر کو دکھانے لے گئی۔ ڈاکٹر نے اسے ہر طرح چیک کیا۔ اس کے خون کو کئی ٹیسٹوں کے لیے بھجوایا۔ ہفتے بھر بعد انھیں بلا کر بتایا کہ منظور کے جسم میں کسی قسم کی کوئی بیماری نہیں۔ کچھ وہم ہے۔ جس کا علاج صرف آرام اور دلی سکون ہے۔ اس نے اسے تین ہفتے آرام کرنے

کا سرٹیفکیٹ دے دیا مگر تین ہفتے بعد منظور کی حالت جوں کی توں رہی، بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، جیسی حالت ہو گئی۔ ناہید پریشان تھی کہ کیا کرے۔ ڈاکٹر حیران تھا کہ ہوا کیا ہے۔ آخر اس نے یہ رائے دی کہ اسے واپس اپنے وطن بھیج دیا جائے۔ شاید وہ وطن کی ہڑک محسوس کر رہا ہے اور اگر ہو سکے تو اسے ناروے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا چاہیئے۔ ناہید اس کے لیے بھی تیار ہو گئی' اس نے سوچا، جان ہے تو جہان ہے۔ چیزیں انسان سے تو بڑی نہیں ہوتیں۔ مکان کی فروخت کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ سیکڑوں خریدار تھے جو سامان اور ان کی محنت تک کی بھی قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ مگر منظور اس کے لیے بھی راضی نہ ہوا۔ بولا" لوگ ہزاروں روپیہ خرچ کر کے یورپ آنا چاہتے ہیں اور میں ہزاروں برباد کر کے واپس جاؤں تو مجھ سا بے وقوف اور کون ہو گا؟"

ناہید اسے تفریح کے لیے اسپین وغیرہ کہیں باہر لے جانا چاہتی تو وہ تیار نہ ہوتا۔ اخراجات کا خوف اسے کچھ بھی نہیں کرنے دیتا۔ وہ اچھے اچھے کھانے پکاتی، گھر کو سجاتی، سنوارتی، تاکہ منظور کو گھریلو خوشیاں عطا کر سکے، مگر ادھر بھی منظور کا تعاون نہ ہونے کے برابر رہتا اور کوئی بھی مریض جو معالج کو تعاون نہ دے، ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ آس پاس لوگ گھروں کو سجا سنوار رہے تھے۔ باغیں باغ میں سبزیاں اور پھول وغیرہ لگا رہے تھے۔ مگر ان کے گھر کے باغیچے کی گھاس تک پانی کو ترستی سوکھتی جا رہی تھی۔ ناہید اکیلی اور پھر حاملہ، آخر اتنے بڑے گھر کو کیسے سنبھالتی۔ اوپر سے منظور کا منفی رویہ اس کا دل ہی توڑے ڈالتا تھا۔ منظور خود بھی ایک ایسا پودا بنتا جا رہا تھا جس کی جڑوں میں پانی پڑنا بند ہو گیا ہو اور اس کے پھول پتے مرجھانے لگے ہوں۔ گھر سے کہیں زیادہ ناہید کو فکر مند کرنے والی منظور کی صحت تھی۔ ڈاکٹر خود نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔ آخر ایک نفسیاتی معالج نے جب ناہید سے اس کے سارے گھریلو حالات کی کہانی سنی اور منظور کے عام رویہ کے بارے میں مفصل آگاہی حاصل کی تو تجویز کیا کہ منظور کی زندگی کیلئے ضروری ہے کہ وہ لوگ اگر اپنے وطن واپس نہیں جا سکتے تو کم از کم اسی مکان میں منتقل ہو جائیں جہاں سے انہوں نے شفٹ کیا تھا ــــــ اور بے بس ناہید نے نفسیاتی معالج کی تجویز کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ ہرے بھرے درخت کا رس چوسنے والی بیل آہستہ آہستہ اسے اپنے پنجوں میں جکڑ رہی تھی۔

سراب

کل ان کے قبیلے میں شادی ہوئی تھی۔ رات دیر گئے تک خوب رونق میلہ رہا تھا صبح سب تھکے ماندے گہری نیند میں غلطاں پڑے تھے۔ بجّو رات کو جلدی سو گیا تھا اس لیے صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ ذخیرے کے درختوں پر چاروں طرف سناٹا تھا ترنگ کی لہر میں وہ ذخیرے کے سارے درختوں پر اِدھر اُدھر کودتا پھاندتا پھرا۔ ذخیرے کے بیسیوں درختوں پر سب اپنا ہی راج تھا۔ جہاں چاہو، جاؤ۔ جدھر دل چاہے، کھیلو۔ درختوں کے پھل کھاؤ، ٹہنی ٹہنی، پتّہ پتّہ کودو، پھاندو۔ کوئی ممانعت نہیں تھی۔ ہاں بڑے باپو نے کہا تھا۔ تین کھونٹ گھومو، موج کرو، مگر چوتھے کھونٹ مت جانا۔ اس نے سوچا۔ چوتھی طرف ضرور کوئی بات ہو گئی جو بڑے باپو ادھر جانے کو روکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے خود چھپ چھپ کر اُدھر جاتے ہوں اور صرف ہمیں ہی منع کرتے ہوں۔ اب سب سو رہے ہیں، اگر میں چوتھی طرف ایک جھلک دیکھ بھی لوں گا تو کسی کو کیا پتہ چلے گا۔ تین اطراف تو ہزاروں بار دیکھ چکا ہوں۔ ایک طرف تو ہماری ہی شکل کے کسی دیوتا کا پوجا گھر ہے۔ ہم ادھر جاتے ہیں تو لوگ ہمیں بڑے پیار سے دیکھتے ہیں۔ اس کے صحن میں ہم گھنٹوں کھیلتے رہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ الٹا لوگ کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ ڈالتے ہی رہتے ہیں۔ دوسری طرف قصبے کا چھوٹا سا بازار ہے، جہاں انواع و اقسام کی چیزیں بکتی ہیں۔ پوجا گھر کی قریبی تین چار دکان پر مٹھائی اور پھول بکتے ہیں۔ ہم میں سے

کوئی ایک آدھ دانہ مٹھائی کا اٹھا لیتا ہے تو دکاندار اوّل تو نظر انداز کرتے ہیں ورنہ بس ذرا ہاتھ لہرا کر ہمیں بھگا دیتے ہیں۔ ایک بار ایک دکان دار نے ہمارے ایک بھائی کو چھڑی مار دی تھی تو قصبے کے سب لوگ اس سے ناراض ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ اس کی دکان بند کروا کے اسے قصبہ بدر کر دیں کہ اس نے معافیاں مانگ مانگ کر اور آئندہ ہم ہاتھ نہ اٹھانے کا وعدہ کر کے ہی بڑی مشکل سے جان چھڑائی تھی۔ تیسری طرف کچھ لوگوں کے گھر ہیں۔ جدھر ہم کبھی کبھی مٹر گشت کرنے نکل جاتے ہیں تو لوگ ہمیں کچھ بھی نہیں کہتے۔ ہاں ہمارا ان کا ایک آدھ کپڑا پھاڑ دینا انہیں بالکل نہیں بھاتا۔ باپو نے اس سلسلے میں بھی منع کیا ہے کہ خواہ مخواہ کسی کا نقصان کرنے کا کیا فائدہ؟ اپنی بنی بنائی عزت خراب ہوتی ہے مگر ہم کیا کریں۔ جوانی چڑھتے دانتوں میں کھجلاہٹ ہوتی ہے تو کپڑے کی ملائم سطح دانتوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔ خیر باپو کے رعب اور سمجھانے سے یہ غلطی بھی ہم سے کم ہی ہوتی ہے۔

سب سو رہے ہیں۔ چوتھی طرف جھانک لینے میں کیا حرج ہے۔ جب تک سب اٹھیں گے، میں واپس آ چکا ہوں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو گی۔

ارے ادھر بھی کوئی خاص بات نہیں۔ بجّو نے دیکھا، چند گھر ہیں اور ان کے کوٹھے ہیں۔ جن کی چھتوں پر لوگ صبح کی گہری نیند میں سو رہے ہیں۔ ذخیرے کے درختوں کے ساتھ لگتے چوبارے کی چھت پر ایک نوجوان لڑکا سو رہا ہے۔ اب وہ آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا ہے۔ میں رکوں یا بھاگ جاؤں۔ میں اس سے کافی دور ہوں۔ بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھتا ہوں کہ ادھر دیکھنے لائق اور کیا ہے۔ لڑکے نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ ارے وہ تو میری طرف اشارے بھی کر رہا ہے۔ جیسے مجھے پاس بلانا چاہتا ہو مگر ساتھ ساتھ جانے وہ عجیب و غریب شکلیں بنا بنا کر ہنس کیوں رہا ہے۔ میں کوئی ہنسنے کی چیز ہوں۔ اس نے اپنی جیب سے کچھ بھنے ہوئے چنے نکال کر چھت پر بکھیر دیئے ہیں۔ یہ سب مجھے پھنسانے کی چالیں ہیں۔ نہ بابا چوہالنڈورا ہی بھلا۔ باپو نے ادھر آنے کو منع کر رکھا ہے۔ بس یہی کافی ہے کہ میں ادھر چلا آیا۔ میں چلا۔

دوسرے دن موقع پاکر بجّو پھر ادھر چلا آیا۔ لڑکے کی عجیب و غریب شکلیں بنانا اسے اچھا لگا تھا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وہ عین اس وقت ادھر آیا تھا جب لڑکا ابھی ابھی جاگا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ پھر بہت خوش ہوا اور اسے پھر اشاروں اشاروں میں اپنے پاس بلانے لگا۔ بجّو اسے دور دور سے ہی نظریں گھما گھما کر دیکھتا رہا۔ آج اس نے کوئی سفید سی مٹھائی چوبارے کی دیوار پر رکھ دی۔ شاید برفی تھی۔ بجّو کو برفی بہت پسند تھی۔ وہ ٹھنی ٹھنی پتّہ پتّہ دیوار کے قریب پہنچا۔ لڑکا اسے موقعہ دیتا ہوا تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے جھپٹ کر مٹھائی اٹھائی اور واپس اپنی ڈال پر لوٹ آیا۔ اور غڑپ غڑپ ساری مٹھائی پپوٹے میں بھرلی۔ لڑکے نے پھر بہت سے چنے دیوار پر بکھیر دیئے۔ بجّو واپس لوٹنے لگا تو دیکھا لڑکا بہت دور کھڑا تھا۔ وہ رُک گیا اور دونوں ہاتھوں سے باقی سارے چنے بھی چن چن کر پپوٹا بھرنے لگا۔ لڑکا دور اے کونے میں کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ سارے چنے ختم کر چکا تو لڑکے نے اور برفی نکال کر ہتھیلی پر رکھ لی۔ بجّو آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ پھر آگے بڑھا مگر ڈر کر واپس لوٹ آیا۔ لڑکے نے برفی اس کی طرف پھینک دی۔

آہستہ آہستہ ان میں دوستی ہوگئی۔ اب وہ آرام سے اس کی چارپائی پر اس کے پاس جا بیٹھتا۔ اس کے ہاتھ سے چیزیں کھا لیتا۔ لڑکا جو کچھ کھاتا اسے بھی ضرور کھلاتا۔ بجّو وقت بے وقت جب چاہتا، بزرگوں کی نظر بچا کر اُدھر پہنچ جاتا اور گھنٹوں لڑکے کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ اب لڑکا اسے کندھے پر بٹھا کر شہر بھی لے جانے لگا تھا۔ جہاں اس کے دوسرے دوست بھی اس کے ساتھ بہت پیار سے پیش آتے تھے اور کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔

ذخیرے کے بزرگوں کو شک ہو گیا تھا کہ بجّو اکثر اپنے ذخیرے سے غائب ہو کر علاقہ غیر میں پہنچ جاتا ہے۔ اس لیے بجّو نے کچھ دن اُدھر جانے کا خیال ترک کر دیا تاکہ اس کا وشواس پھر سے قائم ہو سکے۔ آخر پانچ چھ دن کے صبر آزما انتظار کے بعد وہ پھر اُدھر پہنچ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ لڑکا اس کی اتنی طویل غیر حاضری پر ضرور ناراض ہوگا، مگر نہیں

لڑکے نے اسے پہلے ہی دن جیسا پیار دیا اور کندھے پر بٹھا کر پھر گھمانے پھرانے لے گیا۔ ہاں اس بار اس نے یہ ضرور کیا کہ بجو کے گلے میں ایک پٹہ اور رسی ڈال دی۔ بجو بھی اب اس کے ساتھ کا عادی ہو گیا تھا۔ ویسے لڑکا اس کا خیال بھی بہت رکھتا تھا یا شاید اس شہر کی ریت ہی پریت کی تھی کہ بجو نے بڑی خوشی سے تھوڑی سی پابندی برداشت کر کے اس کے ساتھ رہنا قبول کر لیا۔ اسے ذخیرے کے ساتھی یاد تو آتے مگر یہاں کا آرام اور خلوص بھی اچھا لگتا۔ وہ سوچتا چڑیوں کے بچوں کو بھی پر لگتے ہیں تو ماں باپ کو چھوڑ کر اپنی راہ اڑ جاتے ہیں۔ اگر وہ یہاں چلا آیا تھا کیا خاص بات ہوئی اور وہ اب لڑکے کے ساتھ رہنے لگا۔

کچھ دن بعد نجانے لڑکے کو اس شہر کی کیا ادا اکھر گئی کہ اس نے اس شہر کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ اصل میں کچھ لوگوں کو زیادہ آزادی راس نہیں آتی اور یہاں اپنا راج تھا۔ چاہو تو راجہ کو رکھو۔ چاہو تو اسے ہٹا کر دوسرے کو تخت پر بٹھا دو۔ دور کے ڈھول سہانے، اور نئے تجربے کے خیال سے وہ بجو کو کندھے پر بٹھا کر پڑوس نگری پہنچ گیا۔ اس نے سوچا۔ وہاں دودھ کی ندیاں بہتی ہوں گی۔ کیوں کہ ادھر سے جو بھی آتا تھا۔ دولت کی ریل پیل کی ہی بات کرتا تھا۔ اس نے سوچا وہ بھی کیوں نہ نئے نگر جا کر بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے مگر وہاں جا کر اسے پتہ چلا کہ واقعی وہاں دولت کی ندی تو بہتی تھی مگر وہ گنتی کے چند ہی گھروں کے کناروں کو چھو کر گذرتی تھی یا صرف ان لوگوں پر مہربان ہوتی تھی جو وہاں کے بادشاہ سلامت کی برش جیسی مونچھوں اور شاہانہ چمک دمک پر رطب اللسان رہتے تھے لڑکا تھا تو سمجھ دار مگر اس کے ذہن میں ان خوشامدانہ تعریفی الفاظ کا ذخیرہ بہت کم یا شاید نہ کے برابر تھا جس سے بادشاہ لوگ خوش ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ نئے نگر میں زیادہ دن نہ چل سکا اور بھوکا مرنے لگا۔ ایک دن اس نے بجو سے کہا، "بیٹے آؤ کچھ کام کریں، ورنہ بھوکے مر جائیں گے اور اب واپس جانے کا بھی تو چارہ نہیں۔ تو نے غلطی کی کہ بزرگوں کا کہا نہ مانا اور چوتھے کھونٹے اتر آیا۔ میں نے غلطی کی کہ دودھ کے کٹورے کو لات مار کر ادھر چلا آیا۔ وہاں بھینس دودھ نہیں دیتی تھی تو ہم اس کی گھاس روک لیتے تھے۔ یہاں تو کوئی شنوائی

ہی نہیں۔ آؤ اب اپنی کرنی مل کر بھگتیں۔"

چنانچہ اس نے خود کئی قلا بازیاں لگانی سیکھیں۔ بنسری اور ڈگڈگی خریدی۔ بجو کو تماشے کرنا سکھائے۔ اس طرح دونوں کے پیٹ کا دھندا چل نکلا۔ بجو کبھی کبھی ترنگ میں نہ ہوتا تو کرتب تماشے دکھانے سے انکار کر دیتا۔ مجبوراً لڑکے کو اسے ڈنڈا دکھانا پڑتا۔ اور ڈنڈا تو اچھے اچھوں کو سیدھا کر دیتا ہے۔ نئی جگہ آگر یہ بات بجو بھی سمجھ گیا تھا اور خود اس کا مالک بھی جسے وقت نے ایک دم لڑکے سے بوڑھے میں تبدیل کر دیا تھا۔ بیچ میں جوانی تو کہیں ایسے اڑنچھو ہو گئی تھی جیسے اس راہ پر آئی ہی نہ ہو۔

"دے سخی داتا۔ تیرا بھلا ہو گا۔" تماشا دکھا کر اس نے منگرا بیچ میدان دھرا تھا کہ اس میں پہلا سکہ جو پڑا وہ دس کا نوٹ تھا۔ اس نے نوٹ ڈالنے والے کی طرف دیکھا اور اس کے منہ سے دعاؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اتنی بڑی رقم اور یک مشت دو سال تک الٹی سیدھی پٹخیاں کھانے اور بجو کو نچانے اور تماشے دکھانے کے بعد اس نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔

"مداری۔ یہ بندر ہمیں دو گے؟" اجنبی نے سوال کیا۔

"صاحب۔ یہ تو میری روٹی روزی کا وسیلہ ہے۔" وہ بولا۔

"مہینے میں کتنا بنا لیتے ہو؟"

"یہی سو سوا سو سرکار۔ بس حضور روٹی روزی کا دھندا ہو جاتا ہے۔"

"میں تمہیں سال بھر کا خرچہ دے دوں تو بندر سے جدا ہونا برداشت کر لو گے؟"

وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ بندر اس کی روٹی روزی کے وسیلے کے ساتھ ساتھ دوست بھی تو تھا۔ وہ اپنے سارے دکھ درد اسے ہی سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا کرتا تھا۔ وہ بولا۔ "صاحب۔ بجو میرا ساتھی ہی نہیں، بھائی بھی ہے اور میرے وطن کی نشانی بھی۔"

"دیکھو۔ بھائی بھائی سے جدا ہوتا ہوا آیا ہے، کون زندگی بھر ایک ساتھ رہ پایا ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔" اجنبی بولا۔ لو یہ ڈبل رقم ہے۔ آپ انکار نہ کرنا ہیں

تمہارا بجو پسند آگیا ہے مگر فکر مت کرنا۔ میں اسے بہت آرام سے رکھوں گا۔"
اور اس نے نوٹوں کی گڈی زبردستی نہ نہ کرتے مداری کے ہاتھوں میں گھیٹر دی۔ مداری نے بجو کو اجنبی کے کندھے پر بٹھا کر رسی اس کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔ وہ پہلے بھی تماشہ دکھانے کو بجو کو کسی کے کندھے پر بٹھا دیتا تھا اور بجو کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اور اس آدمی کے ہاتھ سے کوئی کھانے کی چیز پا کر منہ میں بھر لیتا تھا یا کوئی اگر اسے نوٹ یا سکہ پکڑاتا تو وہ اسے لاکر مداری کو دے دیتا تھا یا اس کے منگرے میں ڈال دیتا تھا۔
بجو بہت دیر اجنبی کے کندھے پر بیٹھا رہا اور اجنبی لمحہ بہ لمحہ، قدم بہ قدم مداری سے دور ہوتا گیا۔ بجو سمجھا شاید اجنبی اسے کھانے کی کوئی چیز دلوانے کے لیے کسی دکان کی طرف لیے جا رہا ہے مگر جب اجنبی گھنٹہ بھر چلنے کے بعد بھی کہیں نہیں رکا تو بجو پہلے تو اس کے کندھے پر مچلا اور پھر چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ اس نے مڑ مڑ کر پیچھے دیکھا مگر ہزاروں چہروں میں اس کا شناسا چہرہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اس نے واپس بھاگ جانا چاہا مگر گلے میں پڑی رسی کے جھٹکے نے اس کے قدم روک لیے۔ اجنبی نے پہلے تو اسے ہلکے سے کھینچا مگر بجو جب کھچا ہوا وہیں رکا رہا اور دانت بھی دکھانے لگا تو اجنبی نے اسے چھڑی دکھائی جو وہ مداری کے ساتھ اٹھا لایا تھا۔ مجبوراً بجو رسی کی دوری تک اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتا سا ساتھ چلنے لگا۔ اجنبی نے ایک دکان سے اس کے لیے مٹھائی اور چنے خریدے، بجو کو دکھائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ روٹھا سا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اجنبی ہر دس پندرہ منٹ بعد چنے اس کی طرف بڑھاتا۔ آخر بھو کے پیٹ نے چند چنے اس کی ہتھیلی سے اٹھا کر منہ میں ڈال لیے۔ پیار پیار سے اجنبی نے باقی چنے اور مٹھائی بھی آہستہ آہستہ اسے کھلا دی اور پھر اپنے کندھے پر سوار کر لیا۔
بجو تین چار دن تو بہت اداس رہا۔ اجنبی کے گھر اس کی چارپائی سے بندھا ہر وقت دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ اجنبی کے جھوٹے سچے پیار اور کبھی ڈنڈے کی مار کا عادی ہوتا گیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں نئے نئے واقعات آنے لگے۔ مداری کے ساتھ وہ زندگی بھر پیدل چلتا رہا تھا۔ اس نے پہلی بار عجیب وغریب

گاڑیاں دیکھیں۔ اڑنے والی جادوئی دری دیکھی۔ وہ ایک بالکل نئے ملک آگیا تھا۔

نیا ملک، نئے لوگ، نیا مالک اور نئے نئے تماشے۔ ہاں اسے یہاں بھی تماشے دکھانے پڑتے۔ مالک کے ڈنڈا دکھاتے ہی اس کے ہاتھ گٹھڑی اٹھاکر بغل میں دبا لیتے اور وہ ایک طرف کو چل پڑتا جیسے سسرال جارہا ہو، بیوی کو لانے۔ ڈنڈا ہاتھ میں لے کر کمر جھکا کر یوں چلتا جیسے بوڑھا ہوگیا ہو۔ ڈنڈے کی بندوق بناکر ملٹری کا جنرل بن جاتا۔ پچھلے ملک میں اس کی یہ ادا بہت پسند کی جاتی تھی۔ جب وہ تماش بینوں کو آنکھیں اور دانت دکھاتا ان پر بندوق تان لیتا تھا۔ اس کی یہ ادا اچھے اچھوں کی جیبوں سے اچھی بھلی رقمیں نکلوا لیتی تھی۔ وہاں رعب کی اداکاری سے لوگ پیسہ پھینکتے تھے۔ شاید جس میں چھپا ان کے دلی دکھ کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ یہاں لوگوں کو پیسہ پھینکنے کی عادت تھی۔ بھاری جیبیں بھی کیا کرتی ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔

نئے ملک میں وہ نئی نئی جگہ تماشے دکھاتا پھرا مگر نئے ملک کے نئے تقاضے تھے جن کا نہ مداری کو علم تھا اور نہ بجو کو۔ اگر مداری کو علم تھا بھی تو وہ جان بوجھ کر لاعلم بنا ہوا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ نئے ملک میں اس نے پندرہ بیس تماشے بھی دکھا لیے تو پچاس بجوؤں کی قیمت وصول ہو جائے گی۔ ملک چھوڑنا پڑا تو وہ بجو کو کسی درخت پر بٹھا کر اپنی راہ لے گا یا داؤ لگا تو ایسے ہی کسی دوسرے بڑے امیر ملک میں داخل ہو جائے گا۔

بجو دیکھتا، نیا ملک، نئے لوگ، نئی آزادیاں اور کھانے پینے کی افراط مگر پھر بھی فکر اور کرب کی آڑی ترچھی لکیریں دل کی تمام دنیا کو کاٹتی اندر ہی اندر چلتی سی محسوس ہوتی رہتیں۔

وہ جگہ بہت بڑی تھی۔ کھلی سڑک، دور جس کے ایک طرف، ایک محل سی بہت بڑی بلڈنگ۔ دوسری جانب بہت بڑا بھرا بازار، پیچھے ایک بہت بڑا ہوٹل، سینما، اور قسم قسم کی دکانوں کی قطار، جہاں وہ کئی دنوں سے شو دے رہا تھا۔ ہاں نیا مالک اب بجو کے کھیل کو تماشہ نہیں، شو ہی کہتا تھا۔ وہاں بہت بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی اور مالک کی ولایتی ٹوپی میں سکے بارش کی طرح برستے تھے۔ ایسے ہی کسی شو میں کسی گوری چمڑی والے تماش

بین نے اعتراض کیا تھا کہ اسے بجو کو ڈنڈا مارنا تو ایک طرف، دکھانے تک کا بھی حق نہیں۔ اعتراض کرنے والے نے اسے اخبار کی وہ سرخی بھی دکھائی تھی جس میں خود ساختہ بڑے بھائی قسم کے ملک کے صدر نے ایک کتے کے کان کھینچنے پر کچھ لوگوں نے بڑزور اعتراضات کیے تھے۔ یہاں انسانوں پر تو کیا جانوروں پر بھی ظلم برداشت نہیں کیا جاتا۔ حتیٰ کہ انھیں ذبح کرتے وقت بھی ذرا سی بھی تکلیف کا احساس نہیں دیا جاتا۔ اعتراض کنندہ نے اسے بتایا تھا۔ مجبوراً اسے ڈنڈا ایک طرف دھر دینا پڑا مگر اس کے پاس بجو کو نچانے کا دوسرا طریقہ بھی تھا جو ڈنڈا دیکھے بغیر بھی اسے ناچنے اور تماشے دکھانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ پرانے مالک کی ٹیپ پر ریکارڈ شدہ آواز تھی جسے نیا مالک بجا کر بجو سے من چاہے کھیل کروا لیتا تھا۔ بجواب بنا ڈنڈے کے بھی ناچ لیتا تھا بلکہ پہلے سے اچھا ہی ناچتا تھا۔ اب اس کے دل میں ڈنڈے کے لیے نفرت آگئی تھی اور خوف نکل گیا تھا۔ یہاں کا ماحول ہی کچھ اسی طرح کا تھا۔

اس دن مالک نے اپنی ڈگڈگی بجائی ہی تھی اور لوگ جمع ہونے شروع ہوئے ہی تھے کہ دو باوردی سپاہی بھی مجمع میں آ کھڑے ہوئے۔ وہ دراصل اسے وہاں سے ہٹانے آئے تھے مگر بجو کے کھیل میں ایسے محو ہوئے کہ اپنی ڈیوٹی تک بھول گئے۔ بعد میں انھیں جب ہوش آیا تو ان کی حاکمانہ رگ پھڑکی۔ فرمایا "بھاگ یہاں سے۔ یہاں یہ سب منع ہے۔"

مجبوراً اسے شو بند کرنا پڑا۔ دوسرے دن پھر اس نے مجمع لگایا تو اسے دھر لیا گیا اور تھانے لے جا کر اس شرط پر چھوڑا گیا کہ وہ ہفتے کے اندر اندر بجو کو اپنے وطن بھیج دے گا۔ وہ رویا پیٹا تو بہت، اپنی غریبی، روزگار اور مجبوریوں کا واسطہ دیا۔ کہا کہ حضور یہی تماشے دیکھنے ہزاروں کی رقمیں خرچ کر کے آپ کے شہری ہمارے ملکوں کو جاتے ہیں۔ میں تو خدمتِ خلق کے جذبے سے آپ کے من بھاتے تماشے کو آپ کے دروازے پر لے آیا ہوں۔ مجھے تو حضور سرکار دربار سے انعامات سے نوازا جانا چاہیئے اور آپ الٹا۔ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا مگر ادھر سے ایک ہی رٹ لگی رہی کہ یہاں دوسرے ملک کے جانور

رکھنے کی اجازت نہیں۔ آخری کوشش کے طور پر وہ بولا۔

"جانور؟ بجو جانور نہیں۔ یہ تو میرا بھائی ہے، میری روٹی روزی کا وسیلہ ہے۔"

"تو کام کرو۔ خود کام کیوں نہیں کرتے۔" داروغہ نے سوال کیا۔

"کام کہاں ملتا ہے صاحب۔" اس نے فریاد کی۔

"یہاں کام کی کمی نہیں۔ ہمیں تو مزدوروں کی اشد ضرورت ہے۔ بولو کام کروگے؟"

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ وہ اسی چکر میں تو یہاں آیا تھا۔ سر ہلاتے ہی اسے کام کرنے کا اجازت نامہ مل گیا، اب اسے بندر کی کیا ضرورت تھی۔ مرے چاہے جیئے۔ کام نہ لگنے تک اسے بیکاری بھتہ ملنے لگا۔ جس کی پہلی قسط ہی اس قدر تھی کہ بجو کو آرام سے واپس بھجوایا جا سکتا تھا۔ اس نے بجو کو پرانے مالک کے ہاں واپس بھیج دیا، ساتھ میں پہلے سے تین گنا زیادہ رقم بھی۔

پرانے مالک نے کچھ دن اسے آرام سے رکھا مگر پیسہ ختم ہوتے ہی پھر بدستور پرانی ڈگر پر اسے بازار لے آیا۔ نچانے کے لیے ڈنڈا اٹھایا کہ اسے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ آتا ہی نہیں تھا مگر بجو ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور نہ ہی اس بیچ مالک کی پیسے کے زور پر بڑھ گئی۔ بڑی بڑی ڈراؤنی مونچھوں سے خوف زدہ ہوا۔ وہ بدل چکا تھا۔ اسے دوسری قسم کی ہوا لگ گئی تھی۔

دوسری رات اس نے گلے سے رسی نکالی اور بھاگم بھاگ واپس اپنے درختوں کے ذخیرے میں پہنچ گیا۔ جہاں اس کے پرانے بندر بھائی قیام کرتے تھے۔ اس نے اب نہ صرف خود چوتھے کھونٹ جانے سے توبہ کرلی تھی۔ بلکہ ایک تجربہ کار بزرگ کی طرح نئے اٹھتے بالے نوجوان بندروں کو ادھر جانے سے منع بھی کرنے لگا تھا۔

طلوع

وہ سوچتا ناروے میں اس کا کون ہے۔ پیسہ ہے مگر پیسہ بیٹی بیٹا یا رشتہ دار تو نہیں ہوتا۔ مغربی محبوبہ چمک دمک کی دیوانی ہوتی ہے۔ اسے مشرقی بیوی کے رتبے کی عظمت کیا معلوم۔ کچھ دن پہلے وہ مرتا مرتا بچا ہے، ایک بار پھر بیمار ہوا تو اس کی بولو رام ہو جائے گی۔ جانے موت اسے کس گھاٹ پہ مارے۔ وہ سوچتا تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ وہ ستلج کے کنارے پیدا ہوا تھا۔ پنجاب کے حالات اسے بے چین کر دیتے۔ کیا اس کی آخری خواہش پوری نہ ہو سکے گی۔ اور اس کی راکھ کا کچھ حصہ ستلج کے پانیوں کو ترستا رہے گا۔

پنجاب میں بے گناہوں اور دانشوروں کا جگہ جگہ قتلِ عام، ہٹ لسٹیں، 'ہندو سکھ بھائی بھائی' کا نعرہ لگاؤ اور گولی کھاؤ۔ ہر مندر صاحب کا سیاسی قلعہ بنایا جانا، اس پر فوجی حملہ، اندرا گاندھی کا بہانہ اور وشواس گھاتک قتل، بے گناہ سکھوں کا قتل عام۔ اِک آگ کا دریا تھا کہ کنارے توڑ توڑ کر شہروں اور بستیوں میں گھسا چلا آتا تھا۔ باہر رہنے والے کچھ لوگ دور اوپر اونچے کوٹھوں پر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے، تالیاں بجاتے اور لڑنے والوں کو شاباش دیتے تھے۔ جیسے کچھ بگڑے نواب قسم کے لوگ مرغوں اور مینڈھوں کو لڑا کر شور مچاتے اور تماشہ دیکھتے ہیں۔ یہ تماش بین لوگ اتنی اونچائی پر کرسیاں ڈالے بیٹھے ہوتے ہیں کہ نیچے لڑتے جانوروں کے قدموں سے اٹھتی دھول تک بھی ان تک نہیں پہنچ

پانی اور ڈھول کے دھند لکے میں وہ یہ تک نہیں دیکھ پاتے کہ کون ہارا، کون جیتا یا آٹے کے ساتھ ساتھ کتنا بے گناہ گھن پس گیا۔ یہ لوگ عادتاً اور خوشی کی لہر میں واہ وا اور شاباس شاباس کی گردان لگائے جاتے ہیں اور جب ڈھول بیٹھتی ہے تو انھیں اتنی فرصت کہاں کہ لڑنے والوں کا کیا لوٹا، کہاں زخم آیا۔ پوچھتے پھریں۔ وہ تو اپنے تھکے ہوئے گلوں کو انواع و اقسام کی وہسکیوں سے ٹکوریں پہنچانے ادھر ادھر اپنی طویل و عریض اور عظیم بلڈگوں کی بارول میں پناہ گزین ہو جاتے ہیں۔

بیماری کے بعد اسے نیند بہت کم آتی تھی۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد بے گناہ سکھوں پر مظالم اسے اور زیادہ غمگین کرتے اور نیند کی گولیاں بھی اس پر کوئی اثر نہ کر پاتیں۔ وہ سوچتا رہتا کہ دکھ کے اتنے بڑے ساگر سے کیا وہ چند قطرے بھی کم نہیں کر سکتا۔ اخبارات میں ایسی ایسی دہشت ناک تصویریں آنے لگی تھیں کہ انھیں دیکھ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کٹے بازو، کھلے سر، روتی اور بین کرتی بیوائیں، بے گھر لوگ، جلے ہوئے گھر، یتیم ہو گئے معصوم بچے۔ ان ہی تصویروں میں اس نے ایک معصوم بچے کی تصویر دیکھی جس کے سب رشتہ دار مار دیئے گئے تھے اور وہ ایک جلتے ہوئے مکان کے سامنے اپنی ننھی ننھی مٹھیوں سے آنسو بھری آنکھیں ملتا، آگ کے دریا کے کنارے بے بس لاچار اور بے سہارا کھڑا تھا۔ ایک ہی پل میں اس نے سوچ لیا کہ وہ اسے اپنائے گا۔ ظالموں نے جو کچھ اس سے چھینا ہے، وہ اسے وہ سب دے گا۔ اس نے انڈین ایمبیسی کے معرفت بچے کا پتہ لگوایا۔ وہ دہلی کے ایک کیمپ میں پناہ گزین تھا۔ اس نے نارویجین اتھارٹیز اور انڈین ایمبیسی کے ذریعے اس کی بازیابی کی بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔ آخر اس کی نیک نیتی پر مبنی کوششیں پھل لائیں اور اسے بچے کو ناروے لانے کا اجازت نامہ مل گیا۔ اس نے فوراً بچے کے نام ہوائی ٹکٹ خرید کر کیمپ انچارج کو بھجوا دیا۔ ادھر سے جواب آیا کہ پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات وغیرہ پر قریب دو ماہ لگ جائیں گے۔

بچہ پل پل اس کے خوابوں اور خیالوں میں بسنے لگا۔ دو ماہ اسے دو صدیاں محسوس ہونے لگے۔ وہ یہ دو ماہ اس کے بغیر کیسے گذارے وہ رات بھر بیٹھا سوچتا رہا۔ صبح کام پر جانے سے پہلے

جب وہ شیو کرنے کھڑا ہوا تو اس کے ہاتھ رُک گئے اور کچھ سوچ کر بنا شیو بنائے وہ کام پر چلا گیا۔

کچھ ہی دن پہلے اسے کیمپ انچارج کے خط کے ساتھ بچے کے کوائف ملے تھے۔ ساتھ میں ماں باپ کے ساتھ اس کی تصویر بھی تھی۔ بچے کا نام مہندر سنگھ، اس کے باپ کا راہندر سنگھ اور ماں کا نام لاجونتی تھا۔ عمر اس کی صرف چھ سال تھی ــــ بچے کے لیے گھر میں اس نے ایک کمرے کو سجانا سنوارنا شروع کیا۔ اس کے کھیلنے کا سامان، لکھنے، پڑھنے کی میز کرسی، مختلف چیزوں کے مختلف شیلف، خوب صورت اور رنگین تصویروں والی بہت سی کتابیں اور کامکس کے ساتھ ساتھ اپنے لیے اس نے ایک نئی کار بھی خریدی جس کی بیک سیٹ کھل کر ڈکی کے ساتھ ایک چھوٹا سا کیبن بن جاتی تھی جس میں چلتی ہوئی کار میں بھی بچہ اپنے کھلونوں سے کھیل سکتا تھا۔

چند سال پہلے بیوی کے انتقال کے بعد اس نے سب رونقیں، ہنگامے اور دوستوں کی محفلیں تیاگ دی تھیں۔ ہاں ایک خوب صورت جھیل کے کنارے ایک وے سائیڈ ریسٹورنٹ ضرور کبھی کبھی اس کی شاموں کی تنہائیوں کا ساتھی بن جاتا تھا۔ وہاں سے اکتاتا تو کبھی کبھی کسی چھٹی کے دن جھیل کے کنارے، چٹانوں کی اوٹ میں دھوپ سے لبالب بھری ایک پلیٹ سی شفاف اور سپاٹ جگہ پر آ بیٹھتا۔ جہاں چٹانوں کی سلٹیں اس کے اور اس کی محبوب جھیل کے بیچ پردے کا کام کرتی تھیں اور ہلکی ہلکی دھوپ جسم و دل کی دردوں پر ٹکوریں سی کرتی محسوس ہوتی تھی۔ یہیں وہ اپنا غم دور کرنے کو کبھی کبھی بیئر کی چسکی بھی لگا لیتا تھا۔ اس دن جانے وہ کوئی بیئر کی در پردہ شرارت تھی یا حقیقت پردہ مجاز سے باہر آ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں مَل مَل کر دیکھا تھا۔ زندگی کے تیس چالیس گرم و سرد موسموں کو گذار چکنے کے بعد بھی وہ واقعی ابھی تک تر و تازہ اور پُر کشش تھی۔ اور شلوار قمیص میں تو بالکل پنجابن لگ رہی تھی۔

"بیٹھیے گا حضور!" اس نے جگہ بناتے ہوئے پوچھا تھا۔

وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ ویسے میں ہفتہ یا اتوار کو کبھی کبھی لہروں سے دل بہلانے

آجایا کرتی ہوں۔ بڑی پُر سکون جگہ ہے۔"

وہ بہت دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ بھی تنہا تھی۔ بارہ سال پہلے اپنے وطن میں اس کے حسن کے بیری چند لوگوں نے اس سے اس کا خاوند چھین لیا تھا اور وہ خاوند کی موت کے بعد اپنی چھوٹی چھوٹی دو بچیوں کے ساتھ یہاں بھاگ آئی تھی جو اب خود اپنے گھر بار والی ہو کر اس سے دور امریکہ جا بسی تھی۔ راجندر اور پروین کبھی کبھی اچانک ہی یہیں مل جاتے تھے مگر انڈیا کے حالات نے راجندر کو پھر سے گوشہ نشین کر دیا تھا اور اس نے گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ بہت عرصہ بعد ایک دن پھر اس کے قدم وہیں لے گئے۔ پروین پہلے ہی دری بچھائے وہاں موجود تھی۔

"کہاں تھے؟" اس نے پوچھا۔

"اپنے اندر۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ اندر بھی تو داتا کا دربار کھلا ہے۔ باہر ٹھکراتا ہے تو اپنا اندر ہی پناہ دیتا ہے۔" وہ بولی۔

"یہ اندر باہر کا کھیل بھی عجیب تماشہ ہے۔ اوپر والے نے کھلونا بنا رکھا ہے انسان کو۔" اس نے اداس اور فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"کچھ زیادہ ہی اداس لگتے ہو۔" وہ اس کی کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اپنے وہاں جو کچھ ہو رہا ہے کسی کو بھی اداس کرنے کو کافی ہے۔" اس نے بیگ سے بچے اور اس کے ماں باپ کی تصویر نکال کر سامنے رکھتے ہوئے اور آدمی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "آج کل یہ بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

وہ اسے موقعہ دیتی خاموش بیٹھی رہی کہ وہ کچھ اور کہے۔ وہ بولا "یہ بچہ لاوارث اور یتیم ہو گیا ہے۔ قاتلوں نے جو کچھ اس سے چھینا ہے وہ اسے میں دینے کی کوشش کروں گا۔ وہ قریب دو ماہ بعد یہاں آ رہا ہے۔

"کون ہے؟"

"پتہ نہیں مگر اب تو اپنے ہی جگر کا ٹکڑا لگتا ہے۔"

"میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں۔"

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ! میرے ساتھ بچے کو لینے ایر پورٹ چلو گی؟ دیکھو نہ مت کرنا۔" اس کے لہجے میں ہزاروں التجائیں تھیں۔ "اسے ماں کا پیار بھی تو چاہیئے۔"

اوسلو فورنے بو، ایرپورٹ پر بچے کو ریسیو کرنے سے ایک دن پہلے جب وہ اپنے دوست حمید کے ہاں اوسلو پہنچے تو وہ انھیں پہچان تک بھی نہ سکا۔ راجندر داڑھی مونچھیں بڑھائے، سر پر پگڑی باندھے اور کلائی پر کڑا پہنے، باقی تینوں ککے بھی دھارن کئے ہوئے تھا۔ پروین کا تعارف کراتے ہوئے اس نے حمید کو بتایا کہ چند ہی روز پہلے انھوں نے شادی کرلی تھی۔ پھر اس نے تصویر کے ساتھ بچے کی پوری تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

"ہم کل اسے ایرپورٹ پر لینے جارہے ہیں۔"

بچہ سہما سہما تھا، سُن سُن، خاموش اور چاروں طرف حیرانی سے دیکھتا ہوا پروین اور راجندر کو دیکھ کر وہ تھوڑی دیر کیلئے چونکا ضرور مگر وہ پھر اپنی خاموش دنیا میں ڈوب گیا ـــــ راجندر پروین سے بولا۔ "لاجو"۔ اب وہ اسے اسی نام سے پکارنے لگا تھا۔ "مہندر کو اوسلو بھی تو دکھانا ہے کیوں نہ ہم ہفتہ بھر اور یہاں رک جائیں۔" اور انھوں نے کچھ دن مزید حمید کے ہاں رکنے کا پروگرام بنا ڈالا۔ شاید بڑے شہر کی رونقیں بچے کو اپنا دکھ بھلانے میں مددگار ثابت ہوں۔ انھوں نے سوچا۔

حالانکہ گھر اور کار کی پچھلی سیٹ کھلونوں سے بھری پڑی تھی مگر وہ پھر بھی اسے کھلونوں کی ایک بہت بڑی دکان پر لے گئے تاکہ وہ خود اپنی پسند کی چیزیں خرید سکے۔ وہاں ہر قسم کے بھالو، کتے، بلیاں، شیر، چیتے، آٹومیٹک جھولے، ہوائی جہاز، ریل گاڑیاں، قسم قسم کی موٹریں، الیکٹرانک کھیلوں کی مشینیں اور جانے کیا کیا بھرا پڑا تھا۔ مگر بچے نے کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ خود انھوں نے کوئی کھلونا اسے پکڑا دیا تو اس نے لے لیا اور پھر کار میں رکھ کر بھول گیا۔ سٹین اینڈ سٹرام کے بڑے سٹور میں وہ اسے بچوں کے کپڑوں کے سیکشن میں بھی لے گئے جہاں کئی رنگ برنگے اور خوب صورت ڈیزائنوں

کے کپڑے اسے پہنا پہنا کر انہوں نے دیکھے مگر یہ سب کچھ بھی بچے کے چہرے پر خوشی کی لکیر نہ لا سکا۔ فراگنر پارک کے بچوں کے حصے میں اسے جھولے جھلائے گئے۔ شیشہ کا کھیل کھلایا گیا۔ گدگدی کر کے ہنسانے کی کوششیں بھی ناکام ثابت ہوئیں جیسے ہنسی اس کے ہونٹوں کا راستہ ہی بھول گئی ہو۔

ماں باپ کے ہاں ہار کیا کام۔ انھوں نے ایک دن اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا بس ذرا رنگ برنگی تصویروں کی ہنسانے والی کتابیں ضرور اس کے قریب رہنے دیں۔ اگلے دن وہ پھر اسے Bygdoyalle کے شپ میوزیم لے گئے۔ نئے پرانے چھوٹے بڑے جہاز دکھائے، ان کے بارے ساری کہانیاں بڑے دلچسپ انداز میں اسے سنائیں۔ دور دور تک فیری میں سمندر کی سیریں کرائیں۔ میونخ میوزیم دکھایا۔ سکوتین بادے کے سوئمنگ پول میں اپنے ہاتھوں پر اسے گھنٹوں تیرنا سکھاتے پھرے۔ بچہ سب کچھ ایسے کرتا جیسے وہ کوئی چابی والا کھلونا ہو جیسے سب کچھ جو اس کے ساتھ بیت رہا ہو، وہ اس کا ساتھی نہ ہو۔

اگلے دن صبح انھوں نے اپنے گھر ہونی فاس کے لیے روانہ ہونا تھا۔ شام انھوں نے اسے گرینڈ ہوٹل میں بہترین کھانا کھلایا پھر اسے روشنیوں کا شہر دکھانے ہولمن کولن کی پہاڑی پر ہولمن ریسٹورنٹ لے گئے۔ جہاں ریسٹورنٹ کی کھڑکی سے شہر کا نظارہ کرتے ہوئے انھوں نے آئس کریم کھائی۔

ہونی فاس جاتے ہوتے راستے میں جگہ جگہ کار روکتے اور اسے خوب صورت نظارے دکھاتے وہ اپنے گھر کی طرف بڑھتے گئے مگر ناروے کا تمام حسن بچے کو ذرا بھی اپنی طرف راغب نہ کر سکا جیسے کوئی بہت بڑی قیمتی اور اس کی دل پسند چیز اس سے چھن گئی ہو۔

راجندر اور پردین اپنے وقت کا سب سے زیادہ حصہ اسے ہی دیتے۔ رات کو نارویجین بچوں کی طرح اسے اکیلے کمرے میں نہ چھوڑتے بلکہ اپنے ساتھ چھاتی سے لگا کر سلاتے مگر بچہ رات کو بھی نیند میں کبھی کبھی بڑبڑاتا اور ڈرتا رہتا۔

کچھ دن بعد کیمپ انچارج کا ایک اور خط انھیں ملا جو بچے کے بارے مزید معلومات اور تفصیلات کا مجموعہ تھا۔ یہ جان کر کہ بچے کا باپ ریلوے ملازم تھا۔ راجندر خود بچے کو ساتھ

لے کر او سلو گیا اور تمام ساز و سامان کے ساتھ دس ہزار کروڑ کی ٹرین، دو ریلوے سٹیشن، پہاڑیاں، درخت، پل، واٹر پمپ، لوکو شیڈ، لالٹین، کانٹے، سگنل، سرنگیں، پلیٹ فارم سائڈنگس وغیرہ خرید لایا اور انھیں بچے کے کمرے کے ایک کونے میں ایک بہت بڑی میز پر پورا ریلوے سسٹم کی طرح سیٹ کر دیا۔ دیکھنے میں ٹرین پرانے زمانے کی سٹیم انجن سے چلنے والی لگتی تھی۔ اور اسی لئے بہت مہنگی بھی ملی تھی مگر اصل میں وہ چلتی بجلی سے ہی تھی جو بٹن دبتے ہی اسے اپنی ہی لائن کے پٹے سے حاصل ہونے لگتی تھی۔ یہ سب کچھ بھی بچے کی آنکھوں میں خوشی کی کوئی چمک، کوئی کرن تک نہ لا سکا۔

کام سے آتے ہی راجندر گھنٹوں بچے کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ گھوڑا بن کر اسے گھر کے کونے کونے میں گھماتا پھرتا۔ بچے کا ہاتھ ہی اگر اسے کہیں سے چھو جاتا تو وہ جان بوجھ کر پچھنی کھا کر دور جا گرتا جیسے کنگ کانگ قسم کے کسی پہلوان نے اسے دھکا دے دیا ہو۔ ایسے ہی ایک دھکے کا پوز کرتے ہوئے ایک دن جب وہ اپنے ڈرائنگ روم کے کونے میں ایک سٹول پر کھڑے وائی کنگ کے بڑے بڑے سینگوں والی ٹوپی پہنے اور ہاتھ میں ننگی تلوار لیے ڈراؤنے مجسمے سے ٹکرایا اور مجسمہ اپنی تلوار کا وار کرتا ہوا سا اس کے سر کی طرف جھکا تو بچہ ایک دم چیخ اٹھا۔ "دار جی!"

چیخ سن کر پروین دوڑی دوڑی اندر پہنچی اور سہمے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ مجسمہ کی طرف دیکھتا اور سہما ہوا بچہ پروین کے گلے میں بانہیں ڈالے اس سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کے باپ کو کسی غنڈے نے تلوار سے قتل کیا تھا۔ کیمپ انچارج کے خط میں یہ تفصیل بھی درج تھی۔

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اس محفل میں مَیں بھی مدعو تھی اور حیران کہ وہ ناچ رہا تھا، اچھل اچھل کر، کود کود کر، جیسے دانے بھوننے والی گرم کڑاہی میں گرم گرم ریت پر چنا تڑ تڑاتا ہے۔ یورپی تیز دھنیں ہوتی ہی ایسی ہیں کہ اچھا بھلا شریف آدمی اگر فلور پر ناچنے کی ہمت نہ کر سکے تو اپنی کرسی پر ہی بیٹھا بیٹھا توڑے لینے لگتا ہے جیسے کسی نے اس کی کرسی پر اس کے نیچے دانے بھوننے والی ریت بچھا دی ہو۔ سٹیریو پر نوجوان چھوکروں نے کچھ انگریزی دھن ہی ایسی لگا دی تھی کہ جس پر صرف تڑپا جا سکتا تھا۔ دراصل ان کے پاس کیسٹ ہی ایسی دھنوں کے تھے جن کے ساتھ ناچنے کے لیے کسی فن کاری کی نہیں، توڑے لینے کی ضرورت تھی اور جوان جسموں میں تو اتنی لچک ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کے مروڑے لے سکتے ہے۔

وہ اب عمر کے ایسے پیٹے میں تھا جہاں جسم کے سارے لوچ ختم اور ہڈیاں سخت اور سوکھی لکڑی بن جاتی ہیں مگر اسے نہ صرف جوان چھوکروں کے ساتھ ناچنا تھا۔ بلکہ اپنے ناچ کی لاج بھی رکھنی تھی۔ دراصل پنجاب میں اس کے دور و نزدیک رشتہ داروں اور دوستوں میں کوئی بھی شادی اس کے ناچ کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اور وہ ہزار منتوں اور درخواستوں پر ہر شادی میں خاص طور پر بُلایا جاتا تھا۔ اب جس نے پنجابی بھنگڑے کے مشکل توڑ عبور کر لیے ہوں اس کے لیے مغربی ڈانس کیا مشکل ہوں گے، مگر نہیں۔ میں نے اسے ناروے میں گرمیوں کے سب سے بڑے دن یعنی ۲۲ جون

کو فیول ڈانس بڑی کامیابی سے ناچتے دیکھا تھا جو ہمارے کتھک، کتھا کلی اور بھارت ناٹیم جیسا مشکل تو نہیں سخت اور ترتیب طلب ضرور ہے۔

یہ موقعہ اس کے بیٹے کی شادی کے بعد کی ری سپشن پارٹی کا تھا تو کیا وہ جو پنجاب میں ہر دوست و رشتہ دار کی شادی کے موقعہ پر ناچتا تھا۔ خود اپنے بیٹے کی شادی پر نہ ناچتا۔ اس میں حیرانی کی کیا بات تھی مگر......

بہت پہلے جب اس کی بیوی ابھی ناروے نہیں آئی تھی وہ اسے پنجابی زبان میں اپنے سیدھے سادے خطوط مجھ سے ہی لکھواتا تھا کیوں کہ اس کی بیوی کو پنجابی کے علاوہ اور کوئی زبان آتی ہی نہیں تھی۔ وہ خود بھی پنجابی کے علاوہ اور کوئی ہندوستانی زبان اچھی طرح نہیں جانتا تھا اور پنجابی بھی اسے لکھنی پڑھنی نہیں صرف بولنی آتی تھی۔ ہاں ناروے تین چار سال رہنے کے بعد نارویجین اسے ضرور گذارے لائق آگئی تھی۔ اس کے خطوں میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔ بس یہی اپنی خیر خیریت کی اطلاع اور بیوی بچوں کی خیر خیریت کی چاہ، اور کبھی کبھی ساتھ چند روپوں کا چیک۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا تھا ”بہن جی۔ آج آپ سے میں ایسا خط لکھواؤں گا جس کے لیے پہلے سے ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگ لیتا ہوں۔“

اور اس نے لکھوایا تھا۔ ”تم یہاں ضرور آؤ۔ میں منع نہیں کرتا مگر تمہیں یہاں میرے ساتھ ایک ایسی چھت کے نیچے رہنا پڑے گا جہاں پہلے سے ایک نارویجین عورت بھی موجود ہوگی۔“

عورت ہونے کے ناطے اس فقرے سے مجھے زبردست ذہنی جھٹکا لگا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اس نیک عورت کا گھر اجڑنے سے بچانے کے لیے اس کی ہر ممکن مدد کروں گی مگر کوئی چست گواہ سست مدعی کو مقدمہ نہیں جتوا سکتا۔ مجھے دیکھنا تھا کہ خود اس کی بیوی کا اس سلسلے میں کیا ردِ عمل ہوتا ہے اور یہ مجھے جلد ہی معلوم ہوگیا۔ جب وہ کچھ ہی دن بعد اس کا ایک خط مجھ سے پڑھوانے کے لیے آیا۔ لکھا تھا ”تم مجھے اپنے پاس بلواؤ یا نہیں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں مگر کسی صورت کسی سوت کو اپنے اوپر برداشت

نہیں کروں گی۔"

واہ یہ تو مدعی کے بہت چست ہونے کے آثار تھے۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ میں کس طرح اس کے کسی کام آسکتی ہوں کہ اچانک حالات خود ہی اس کے حق میں پلٹا کھا گئے جب ایک دن مجھے فارن وومن گروپ کی لیڈر فرخندہ کا فون آیا۔ اسے بھی اسی عورت کا مسئلہ درپیش تھا۔ شاید مجھ پر اعتبار نہ کرتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کا خط کسی اور سے بھی پڑھوا لیا تھا اور بات فارن وومن گروپ تک جا پہنچی تھی۔ جہاں یہ طے پایا گیا تھا کہ نہ صرف اس کی بیوی کو یہاں منگوایا جائے گا بلکہ مناسب ڈھنگ سے آباد بھی کیا جائے گا کہ جنگ، میدان جنگ میں ہی زیب دیتی ہے۔

اب وہ ایک بیٹی اور بیٹے کے ساتھ ناروے آباد ہو چکی تھی۔ یورپ میں دوسری بیوی رکھنے پر تو نہایت سخت قوانین ہیں مگر گرل فرینڈز پر نہیں، چاہے جتنی رکھو۔ میاں نے بس اسے اتنی ڈھیل دی تھی کہ رہوں گا تمہارے ساتھ مگر کبھی کبھی اسے بھی گھر پر بلا لیا کروں گا۔ اس باغیرت شیرنی نے یہ شرط بھی ٹھکرا دی تھی "میرے ساتھ رہنا ہے تو اس کا لانا تو کجا، میرے سامنے اس کا نام بھی نہیں لینا ہوگا۔"

وہ اپنی دس سالہ لڑکی اور آٹھ سالہ لڑکے کے ساتھ اکیلی رہنے لگی تھی۔ اسے اوسلو کمیون کے ایک آفس کی کینٹین میں نوکری مل گئی تھی، شہر میں مکان اور دونوں بچوں کی گارجین شپ۔ اب ایک طرح سے وہ ان کی ماں بھی اور باپ بھی تھی۔ اس نے نہایت سختی سے اپنے خاوند کو گھر میں قدم رکھنے سے بھی منع کر دیا تھا اور نہیں چاہتی تھی کہ اس کا سایہ بھی بچوں پر پڑے۔

کئی سال پہلے پنجاب میں ایک شادی کے موقعہ پر اسے ناچتے دیکھ کر وہ اس پر ایسی فریفتہ ہوئی تھی کہ ایک ہی رات میں عشق کی تمام حدیں پار کر کے اس کے ساتھ کسی دوسرے شہر بھاگ گئی تھی مگر اس کے ملٹری ریٹائرڈ صوبیدار باپ کو اسے تلاش کرنے میں صرف تین دن لگے تھے۔ اُدھر اس کی ماں نے اس کے معاشقے کی ایسے ڈھنگ سے پردہ پوشی کی تھی جیسے کہیں بھی کچھ نہیں ہوا تھا جیسے گھر کی لڑکی گھر کے ایک کمرے

سے دوسرے میں گئی تھی۔ اس نے مشہور کر دیا تھا کہ وہ اس سے پوچھ کر اپنی موسی کے ہاں انبالے گئی تھی۔ پہلے تو ماں باپ نے اسے ہر طرح سے سمجھایا تھا مگر اس کے عشق میں اپنے رانجھے کے لیے ہیر جیسی ثابت قدمی دیکھ کر انھوں نے خود ہی اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ کبھی عشق میں اتنی اندھی، اور اب اتنی سجاگ۔ واقعی وہ شیرنی عورت تھی۔

اب اس کے بچے ناروے کے یورپی ماحول میں پروان چڑھ رہے تھے مگر لڑکی کو جیسے یورپی ہواؤں نے چھوا تک نہ تھا۔ وہ ماں کی سچی ہمدرد اور غم گسار تھی، وہ اس کی اداسی، اکیلے پن اور زندگی سے لڑتی جنگ کو ترحم آمیز نظروں سے دیکھتی تھی اور سوچتی تھی کہ وہ ماں کو کسی قسم کا کوئی رنج نہیں پہنچائے گی۔ اِدھر ناروے کی تازہ پہاڑی ہواؤں، شفاف پانیوں اور بے فکریوں نے اسے جلدی ہی دوشیزگی کے دوار پر لا کھڑا کیا تھا مگر اس کے باوجود وہ سیدھی سادی گھریلو قسم کی لڑکی تھی، ماں نے اسے ہر طرح سے کرید کرید کر دیکھ لیا تھا کہ وہ یورپی ماحول میں رہ کر بھی ہندوستانی گائے ہے۔ آخر اس نے اپنے ہی گاؤں کا ایک شریف لڑکا ناروے منگوا کر اس کے ہاتھ پیلے کر دیئے۔ ادھر اس کا لڑکا سولہ کا سن کراس کرتے ہی پر پرزے نکالنے لگا تھا۔ وہ راتوں کو دیر سے گھر آتا۔ نائٹ کلبوں میں نارویجین چھوکریوں کے ساتھ رات رات بھر ناچتا رہتا۔ کبھی کبھی گھر سے غائب بھی ہو جاتا۔ تب اسے خاوند کی کمی بڑی بری طرح محسوس ہوتی۔ لڑکیاں ماں کے سایہ میں پلتی بڑھتی ہیں مگر لڑکے باپ ہی کی سخت گیر آنکھ سے کنٹرول ہوتے ہیں۔ وہ سوچتی مگر پھر فوراً ہی اپنی کمزوریوں کا گلہ گھونٹ دیتی۔ وہ خود اسے پیار سے سمجھاتی، اپنی مجبوریوں کا واسطہ دیتی، آنکھیں دکھاتی۔ وہ مان بھی جاتا۔ کئی کئی دن گھر سے نہ نکلتا۔ بس گھر اور اسکولوں کے چکروں کے علاوہ سارے سلسلے بند کر دیتا۔ مگر اس کا مشرقی مردانہ حسن، نکلتا قد، گندمی رنگ اور خوب صورت سیاہ گھنے بال، نارویجین لڑکیوں کو پھر اس کی طرف راغب کر لیتے اور وہ اسے گھیر گھار کر راتوں کو اڑا لے جاتیں۔ وہ پھر بہک جاتا کہ وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔

لڑکی تو ہوتا ہی پرایا دھن ہے۔ ماں باپ کو اس کی جدائی کو برداشت کرنا اور اس

کے سکھ کے لیے دعا گو رہتا ہوتا ہے، مگر لڑکا تو اپنے گھر میں رہے اور بڑھاپے کا سہارا بنے یہی ماں باپ کی تمنا ہوتی ہے۔ اور یہ خواہش باہر وطن سے دور اور بھی شدت سے جاگ اٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکے کے معاملے میں وہ زیادہ تنگ دل ہو جاتے ہیں کہ کوئی ان کی یہ لاٹھی ہی نہ چھین لے اور وہ بڑھاپے کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھریں۔ نتیجتاً وہ اسے اور زیادہ مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہی کوشش وہ دن رات کرتی مگر لڑکے کی جوانی کی ہواؤں میں اڑتی پتنگ کا مانجہ لگا دھاگا اس کے ہاتھوں کو زخمی کر کے چھوٹ جاتا اور وہ بڑی ادا اس اور غمگین نظروں سے اسے خلاؤں میں ڈگمگاتے اور کسی کانٹے دار بیری کے درخت پر جا اٹکتے دیکھنے کے دکھ کو اندر ہی اندر جھیلتی رہتی۔

ایک بار تو وہ ایسا غائب ہوا کہ ہفتہ بھر پتہ ہی نہ چل سکا کہ وہ گیا کہاں ہے۔ پہلے دو تین روز تو اس نے کسی سے بھی اس کی گمشدگی کا ذکر تک نہ کیا اور خود ہی اس کی تلاش میں سرگرداں رہی مگر جب پانی سر سے نکل گیا تو وہ میرے پاس پہنچ گئی۔ شاید اسے اپنے معاملات میں میرے غائبانہ تعاون کا علم تھا حالانکہ اس نے اب تک اپنے گھریلو معاملات میں ظاہراً مجھے دخل انداز نہیں ہونے دیا تھا۔

تب میں تارکین کے بچوں پر سکول سائیکالوجسٹ لگی ہوئی تھی اور یہ بھی ایک قسم کی میری ڈیوٹی ہی تھی کہ میں ان کے نابالغ بچوں کی دیکھ بھال کروں اور انھیں بھٹکنے نہ دوں۔ میں نے اس کے سکول سے پتہ کروایا تو مجھ پر عجیب انکشاف ہوا کہ اس نے ایک دوسرے سکول میں داخلہ لے لیا ہے۔ کیوں؟ اب میرے سامنے یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا اور اس کا جواب بھی مجھے اس کے سکول سے ہی مل گیا۔ اس کا باپ اسے اپنے قریبی سکول میں لے گیا تھا۔

اب میری اصل ڈیوٹی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے ہیڈ ماسٹر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ وہ نابالغ ہے اور اس کی گارجین شپ اس کی ماں کے پاس ہے۔ آپ نے اسے اپنے باپ کے پاس دوسرے اسکول کیسے منتقل کر دیا؟" میں نے سیدھا

سوال کیا اور اسے ساری بات بتا دی۔

نارویجین لوگ نہایت سیدھے اور سیدھی بات کو نہ صرف جلدی سمجھ لیتے ہیں بلکہ مان بھی لیتے ہیں۔ اس نے فوراً اس کے نئے اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے رابطہ قائم کیا اور اسے فوراً واپس اپنے اسکول منگولنے کا بندوبست کر دیا۔ ادھر میں نے اس کے باپ کو اپنے آفس بلا کر سمجھایا کہ وہ کسی کے بچے کو ایک دن بھی اپنے ہاں نہیں رکھ سکتا۔ اس پر جس بے جا کا مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔ پہلے تو وہ بہت تلملایا۔ بولا۔ "وہ کسی کا بچہ کیسے ہو گیا۔ میری اپنی اولاد اور اپنا ہی تو خون ہے۔"

"بے شک وہ خون تمہارا ہے مگر بچہ تمہارا نہیں کیوں کہ قانوناً اس کی گارجین شپ اس کی ماں کو ملی ہوئی ہے۔"

"میں نہیں جانتا یہ گارجین شپ کیا بلا ہے۔ میں دیکھتا ہوں آپ مجھ سے میری اولاد کیسے چھین سکتے ہیں۔" اس نے لڑکے کی بانہہ تھام لی۔

مجھے بھی طیش آ گیا۔ بولی۔ "ایسے۔" اور میں نے ریسیور اٹھا کر نمبر گھماتے ہوئے کہا۔ "تھانہ یہاں سے صرف سو گز کی دوری پر ہے۔"

وہ ڈھیلا پڑ گیا اور نارویجین ہیڈ ماسٹر اور میرے سمجھانے پر تو ایک دم برف ہو گیا۔ اب لڑکے کی بانہہ ماں کے ہاتھ میں تھی اور وہ بنا اس سے آنکھ ملائے باہر جا رہی تھی۔ دراصل اسے پہلے سے ہی بلا کر میں نے پاس ہی کے انتظار کے کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر ایک دم انھیں ایک دوسرے کے روبرو لا کھڑا کیا تو میرا دفتر پانی پت کا میدان جنگ بن جائے گا۔ ایسی باتوں کا مجھے پہلے سے ہی علم تھا۔ آخر ان ہی لوگوں کو ڈیل کرنا ہی تو میری ڈیوٹی تھی۔

لڑکا دن بدن تابعدار ہوتا جا رہا تھا۔ ایسی عمر میں اکثر آدمی حد سے زیادہ بگڑ جاتا ہے مگر کبھی کبھی سنبھل بھی جاتا ہے۔ شاید اسے ماں کی مجبوریوں کا احساس ہو گیا تھا۔ اب وہ ہفتوں گھر میں بند رہتا مگر مغربی حسن خود ہی جب ترغیبیں دیتا اس کے دروازے آن کھٹکھٹاتا تو وہ پھر سے بھٹک جاتا۔ اس کا اس کی ماں کو علم تھا اور اسی بھٹکن کو زنجیر

ڈالنے کے لیے وہ ایک بار اپنے گاؤں کی ہائر سکنڈری پاس ایک خوب صورت سی لڑکی کو اپنے ساتھ بطور ٹورسٹ لے آئی۔ اندر ہی اندر اس نے اپنا سب پروگرام لڑکی کے والدین کے گوشش گذار کر دیا تھا۔ ادھر لڑکا بھی اٹھارہ کا سن پاس کر کے بالغ ہو چکا تھا۔

حالات اس کے پروگرام کے مطابق ٹھیک رُخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ آگ اور کپاس کی نزدیکی کو تو ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔ یہاں تو پورے تین مہینے تھے۔ آتش عشق اپنا کام کر چکی تھی۔ آگ میں ایک گن پوتر تا بھی تو ہے۔ ڈھائی ماہ کے بعد جب رادھا رانی نے اپنے بیٹے سے کہا کہ لڑکی واپس جائے گی کیوں کہ اس کے ویزا کے تین ماہ پورے ہونے والے ہیں تو وہ بولا "ماں۔ اگر وہ یہاں رہ جائے تو کیا حرج ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ نادان سی بن کر بولی۔

"شادی کر کے۔" وہ بولا۔

"کون کرے گا اس سے شادی۔ لڑکے کوئی راہوں میں تو نہیں پڑے۔ پھر اس کے ماں باپ کی بھی تو رائے لینی ہو گی۔"

"ماں" وہ خوشامد پر اتر آیا۔ "پہلا کام میں کروں گا۔ دوسرا تم کر دو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور اب اسی بیٹے کی شادی کی ری سپشن پارٹی میں وہ ناچ رہا تھا۔ اسے بلانے رادھا رانی خود اس کے گھر گئی تھی اور وہ اپنی نازنین محبوبہ کے ساتھ آیا تھا جو اتنی بھیڑ بھاڑ میں بھی ایک کونے میں اکیلی بیٹھی تھی۔

پنجاب میں سب دوستوں رشتہ داروں کی پارٹیوں میں وہ ضرور ناچتا تھا۔ اپنے سگے بیٹے کی شادی کی پارٹی میں آکر اگر وہ نہ ناچتا تو رادھا رانی کے دل کو شانتی نصیب نہ ہوتی۔ عشق تیری برداشت کی حدوں کی انتہا معلوم۔ اتنی فتوحات کے بعد شکست اور اپنے ہاتھوں۔

سوال

> نوٹ : اس کہانی کے تمام کرداروں کے نام بالکل اصلی ہیں اور کہانی کی تمام مطابقتیں حقیقی ہیں۔ جب کہانی شروع سے اخیر تک اپنے اصلی روپ میں میرے سامنے موجود ہے تو میں اس کی روپ ریکھا بدل کر اسے کیوں مسخ کروں

آج ماتاجی کے خط کے بعد میں ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں کہ نہیں جانتا کہ میں کدھر کو جاؤں کیوں کہ اس دوراہے سے کوئی تیسرا راستہ پھوٹتا ہی نہیں مگر آج میں اپنے دونوں بزرگوں، باپ کیولرام چاولہ اور باپ جیسے چاچا بھگت ہیرانند سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مجھے غلط راہ پر کیوں گامزن کیا۔ ہم تو سنتے آئے ہیں کہ ہمارے بزرگ بہت سیانے اور عقل مند ہوتے تھے اور وہ سیکڑوں سال آگے کی بھی سوچ لیا کرتے تھے۔ پھر میرے سمجھ دار اور پڑھے لکھے پتا اور دھرم گرنتھوں کو رگ رگ میں بسائے ہوئے بزرگ چاچا کو پچاس پچپن سال آگے کی تصویر کیوں دکھائی نہ دی۔ کیا ان کی سوچوں کی لمبائی اتنی مختصر تھی کہ وہ اتنے تھوڑے عرصہ بعد آنے والے اس وقت کی پہچان بھی نہ کر سکے۔ جب بھائی، بھائی سے خوف کھانے لگے گا۔ وہ دونوں آج اس دنیا میں نہیں ہیں جو میرے اس سوال کا جواب دے سکیں مگر دنیا بزرگوں اور سیانوں

سے خالی تو نہیں ہو گئی۔ میں آج کے سیانوں سے یہ پوچھتا ہوں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ آج میں پَوَن سے اور پون مجھ سے خوف کھانے لگا ہے۔

سیانے کہتے ہیں، بچپن کی سب یادیں لاشعور کے ایک کونے میں محفوظ پڑی رہتی ہیں۔ مجھے یاد ہے میرے والد جب تبدیل ہو کر داؤد خیل جنکشن آئے تھے تو انھوں نے داؤد خیل گاؤں میں بھگت ہیرانند کے گھر کا ایک حصہ کرایہ پر لیا تھا اور تبھی سے انھوں نے بھگت جی کو اپنا چھوٹا بھائی کہنا شروع کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے سگے بھائیوں کو ان سے ایک غلط قسم کی شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ بھگت ہیرانند کو ان پانچوں بڑے بھائیوں سے زیادہ پیار کرنے لگے تھے ــــ بھگت ہیرانند چھوٹی سی دکانداری تو برائے نام سانس کی ڈوری قائم رکھنے کے لیے کرتے تھے ورنہ ان کا ایک ایک سانس گوربانی گانے اور گرنتھ صاحب پڑھتے رہنے میں گذرتا تھا۔ بھگت کی اپنی کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھے ہی اپنے بیٹے کی طرح ہر وقت گود میں لیے لیے پھرتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ گرنتھ صاحب کے پیچھے بیٹھے پاٹھ کر رہے ہوتے تب بھی میں ان کی گود میں ہوتا تھا اور ان کا ہاتھ مورپنکی مورچھل مقدس کتاب پر جھلتا رہتا اور دوسرا پیار سے میرے جسم کا طواف کرتا رہتا۔ گوربانی پڑھتے ہوئے ان کی سفید ہلکی ہلکی تُرشی ہوئی داڑھی ہلتی ہوئی مجھے بہت اچھی لگتی تھی، ویسے نجانے کیوں مجھے تو ان کی ہر ادا اچھی ہی لگتی تھی۔

آپ جانتے ہیں، بچہ تو پیار کا بھوکا ہوتا ہے اور پیار مجھے جتنا ان سے ملتا تھا شاید ہی بابو جی یا ماتا جی سے ملتا ہو گا۔ ماں باپ نے میرا نام ہرچرن داس رکھا تھا اور بھگت چاچا خود سکھ نہ ہوتے ہوئے بھی نجانے اپنے کس جذبے کی تسکین کے لیے مجھے ہرچرن سنگھ کے نام سے بلایا کرتے تھے مگر ساتھ ہی کبھی کبھی جب میرے بال بڑھ کر میری آنکھوں میں گرنا شروع ہو جاتے تھے تو خود ہی قینچی لے کر انھیں تراشش دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔

بابو جی جتنے پڑھے لکھے، سمجھ دار اور سیانے تھے۔ بھگت چاچا بھی اتنے ہی گیانی دھیانی اور انسان دوست تھے۔ مجھے تب ان کی زیادہ تر باتیں سمجھ تو نہیں آتی تھیں۔

مگر لگتا تھا جیسے وہ میرے ننھے ننھے کانوں میں شہد آگیں رس ٹپکا رہے ہوں۔ ان کا منھ ہی منھ میں گوربانی پڑھنا تو میرا دل موہ لیتا تھا۔ مٹھاس کا مزہ صرف زبان ہی سے نہیں، کانوں سے بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس کا پہلے پہل علم مجھے ان کی گوربانی سن کر ہوا تھا اور میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ وہ جب مسلمانوں اور ہندوؤں کے سامنے بھی گوربانی کے شلوک اور کبیر کے دوہے پڑھتے تھے تو لوگ عش عش کرا ٹھتے تھے۔

بابو جی ہنومان اور کرشن کے بھگت تھے۔ انھوں نے گھر میں الماری کے ایک خانے میں ہنومان، کرشن، اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں سجائی ہوئی تھیں۔ اور بڑی باقاعدگی سے ہر روز ان کے سامنے کھڑے ہو کر ان کی استتی کرتے تھے۔ بھگت چاچا کے سمپرک میں آنے کے بعد انھوں نے اپنے چھوٹے سے مندر میں دوسری سب مورتیوں کے ساتھ ساتھ بابا نانک کی تصویر اور خواجہ دل محمد کی منظوم گیتا کے ساتھ خواجہ صاحب کی جپ جی اور سکھ منی صاحب بھی رکھ لی تھی اور وہ دونوں کتابوں سے ایک ساتھ پاٹھ بھی کرنے لگے تھے۔

چاچا کے ایک بہت بڑے کمرے کی دھرم سال میں جہاں ایک بہت ہی خوب صورت تخت پوش پر ریشمی بستے میں لپٹا بڑا سا گرنتھ صاحب رکھا رہتا تھا اور جہاں صبح سویرے بھگت جن صاف ستھری چٹائیوں پر بیٹھ کر چاچا کا پاٹھ سُنا کرتے تھے۔ اسی دھرم سال میں اب ہر شام کو ہرے رام، ہرے رام، رام رام ہرے۔ ہرے کرشن ہرے کرشن، کرشن کرشن ہرے ہرے اور اوم جے جگدیش ہرے کی آرتیاں بھی گائی جانے لگی تھیں۔ جہاں پہلے دھرم سال میں اکثر چاچا کے ہاتھوں کا کڑاہ پرشاد گاؤں کے سب ولیش بھوشا اور سر پر موٹی موٹی چوٹیوں والے ہندوؤں مگر ذہنی طور پر ہر لحاظ سے سکھ حاضرین میں بٹتا رہتا تھا، وہاں اب ریوڑیوں کی صورت ہر منگلوار کو ہنومان کا پرشاد بھی بٹنے لگا تھا۔ منگل کی شام ریوڑیوں کے پرشاد کے لالچ میں چاچا کی دھرم سال میں بچوں کی اتنی بھیڑ ہو جاتی کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہ ملتی اور چھوٹے بڑے اتنی اونچی آوازے سے

مہاں بیر بلوان۔ کرتا سب کا کلیان۔ مانگو بھگتی کا دان۔ دیجے آن آن

گاتے کہ سارا گاؤں گونج اٹھتا۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں جتنا پیار اور خلوص مجھے چاچا سے ملا اپنے ماں باپ سے نہیں مل سکا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں مادرانہ یا پدرانہ محبت سے محروم رہا ہوں۔ نہیں ایسا کہہ کر میں گنہ گار نہیں ہونا چاہتا۔ انہوں نے اپنے تمام فرائض بحسن وخوبی سرانجام دیے۔ مجھے ان سے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں۔ ہاں اپنے لیے ان کی اور چاچا کی محبت کا موازنہ کرتا ہوں تو تھوڑا سا چاچا کا پلڑا بھاری محسوس ہوتا ہے۔

پھر وقت کے بے رحم اور ظالم ہاتھوں نے ہم سے چاچا کو چھین لیا اور اتھل پتھل کے کچھ ہی عرصہ بعد بابوجی بھی بھگوان کو پیارے ہو گئے اور گھر میں ہیں، ماتاجی اور بابوجی کی موت کے ڈیڑھ ماہ بعد جنم لینے والا میرا چھوٹا بھائی پَوَن رہ گئے۔ پَوَن تو ہنومان کے پتا کا نام ہے اور لکشمی وشنو کی استری ہیں پھر پتہ نہیں ہماری لکشمی نام کی ماتاجی نے اس کا نام پون رکھنا کیوں پسند کیا حالانکہ وہ خود بڑے کٹر سکھ وچاروں کی ہیں۔ پون سے بہت بڑا ہونے کی وجہ سے میں بابوجی اور بھگت چاچا کی گودیوں میں پلا بڑھا اور پروان چڑھا ہوں مگر پون شروع سے ہی ماتاجی کے قریب رہا ہے اور ماتاجی جیسا کہ سب جانتے ہیں، ایک ایسے خاندان کی فرد ہیں جس کے آدھے لوگ سکھ اور آدھے ہندو وچاروں کے ہیں یعنی ہماری نانی سکھ اور نانا ہندو تھے۔ اسی کارن جب شادی کے بعد ماتاجی چاولہ خاندان میں آئی تھیں تو جہیز میں میکے سے انھیں ایک خوب صورت سے ریشمی رومال میں بندھا گورو گرنتھ صاحب بھی ساتھ ملا تھا جب کہ اسی گھر سے ان کی بڑی بہن کو جہیز میں بھگوت گیتا دی گئی تھی۔

صبح سویرے دہی بلوتے ہوئے اور گھر کے دوسرے سب کام کاج کرتے ہوئے ماتاجی منہ ہی منہ میں پاٹھ تو پہلے بھی کیا کرتی تھیں مگر بابوجی کے مرنے کے بعد انھوں نے ان کی مورتیوں کے ساتھ بابا نانک اور گورو تیغ بہادر کی تصویریں بھی رکھ لی تھیں۔ اور فرصت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے صبح سویرے پَوَن کو گود میں لیے گوردوارے بھی باقاعدگی سے جانے لگی تھیں اور شام کو رہوراس تو بڑی پابندی سے پڑھنے لگی

تھیں۔ بابوجی کا سایہ سر پر نہ ہونے اور میری نوکری میں مصروفیت کی وجہ سے پون ماں اور باپ دونوں کا پیار ان ہی گود سے حاصل کرنے کی خاطر ہر دم ان سے چمٹا رہنے لگا تھا۔ تقسیم کے بعد شروع شروع میں ہم امرتسر میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ وہاں ماتاجی ہر روز پون کو گود میں لیے پاٹھ تو کیا ہی کرتی تھیں۔ ہفتہ میں دو بار رکشا میں اُس کے ساتھ ہر مندر صاحب بھی جایا کرتی تھیں۔ ویسے پیار تو پون کو میں اور میری بیوی پورنیما بھی کم نہیں دیتے تھے مگر ہمارے پیار کا بھلا ماں کے پیار سے کیا مقابلہ۔

کئی سال بعد میری سروس کے سلسلے میں جب ہم دہلی منتقل ہو گئے تب بھی ماتاجی بڑی باقاعدگی سے واک لینے اور ارداس کرنے گوردوارہ جایا کرتی تھیں۔ بیانہ سے بڑے ماماجی جب کبھی ہم سے ملنے یا اپنے کپڑے کے بیوپار کے سلسلے میں دہلی آتے اور ہمارے ہاں ٹھہرتے تو سب سے پہلے ہم سب کو لے کر گوردوارہ سیس گنج ماتھا ٹیکنے جاتے تھے۔ ماتاجی ہر روز نزدیکی گوردوارے جاتے وقت ہاتھ میں آٹے سے بھری ایک کٹوری لے جاتی تھیں جس پر تھوڑا گھی اور گڑ کی ایک روڑی بھی رکھی رہتی تھی جسے وہ ماتھا ٹیکتے ہوئے باباجی کے چرن کملوں میں ارپن کر آیا کرتی تھیں مگر ایک دن ان کے ایک رویے سے مجھے عجیب سا جھٹکا محسوس ہوا۔ دراصل زندگی میں پہلی بار وہ بھر بھرائی کٹوری گوردوارے سے واپس لے آئی تھیں میرے پوچھنے میری کم پڑھی لکھی ماں نے کہا تھا "وہ کاکا۔ میں تو وہاں من کی شانتی کے لیے جاتی ہوں مگر آج جب میں نے وہاں ہری کیرتن کی بجائے سیاست پر لیکچر ہوتے سنا تو میرے من نے کہا، یہاں تو کسی اور قسم کا پودا لگایا جا رہا ہے جس کی جڑوں میں پانی ڈالنا میری آتما نے گوارہ نہ کیا اور میں اپنا پانی واپس لے آئی۔ میں نہیں کہتی کہ سیاست بری چیز ہے مگر ہر چیز کا اپنا اپنا الگ پلیٹ فارم ہونا چاہیئے۔"

انھوں نے اپنے آٹے اور گھی کو ممتا کی وجہ سے سادہ پانی کہا تھا مگر پھر بھی ان کا یہ رویہ مجھے عجیب سا ہی محسوس ہوتا رہا مگر انھوں نے بنا کسی بات کی پرواہ کیے اپنا زیادہ وقت اب گھر کے چھوٹے سے مندر جمع گوردوارے پر صرف کرنا شروع کر دیا۔ اسی بیچ ہمارے

پڑوس میں ایک سکھ فیملی بھی آکر آباد ہوگئی۔ یہ بہت ہی بھدر، نیک طینت اور خدا ترس لوگ تھے۔ انھوں نے گھر میں ایک پورا کمرہ سجا سنوار کر گورو گرنتھ صاحب کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اب ماتا جی روز صبح سویرے نہا دھو کر باقاعدگی سے وہاں جانے اور واک لینے لگیں۔ وہ ہر گورپرب پر اپنے گھر سے کڑاہ پرشاد بھی بنا کر ساتھ لے جاتیں اور بڑی شردھا سے سنگتوں میں اپنے ہاتھ سے بانٹتی تھیں۔ اسی دوران ہمارے ماما جی کا ایک لڑکا باقاعدہ پانچوں ککّے دھار کے سکھ بھی ہوگیا تھا مگر اس کے اور اس کے باقی تین بھائیوں کے پیار کی مثال بیانہ میں اب بھی پہلے کی طرح دی جاتی تھی۔ وہ جب اپنی دکان کے کام کے سلسلے میں ہمارے گھر آتا تو اپنی خوب صورت داڑھی مونچھ اور پگڑی باندھنے کے دل کش انداز کے ساتھ ہمیں اور خاص طور پر پون کو کوئی آسمانی مخلوق لگتا۔ ادھر ماں کے سنسکاروں سے بھی آہستہ آہستہ اس کے دل میں سکھی دھرم سے ایک خاص التفات پیدا ہو رہا تھا۔ بہت پہلے جب اسے سکول داخل کروایا گیا تھا تو ماتا جی اسے خاص طور پر نہلا دھلا اور صاف ستھرے کپڑے پہنا کر گوردوارے لے گئی تھیں۔ اس کے بعد تو وہ خود سکول میں ہر امتحان کے وقت پہلے گوردوارے ضرور حاضری دینے لگا تھا۔ اور گورو مہاراج کی ایسی مہر ہوتی گئی تھی کہ وہ ہر امتحان میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتا گیا۔

ادھر حالات مجھے ناروے لے آئے اور بہت دھکوں ٹکوں کے بعد میں یہاں انڈیا کی نوکری کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی مناسب طور پر سیٹل ہوگیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پون بی ایس سی کرنے کے بعد انجینئرنگ کرے اور انڈیا میں ہی بہت اچھی طرح سیٹل ہوجائے تاکہ ہم دونوں میں سے ایک تو کم از کم ماں کا سہارا بنا رہے لیکن فارن کا کریز وہ جادو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ خود میں نے ادھر بڑے بڑے ڈگری یافتہ لوگوں کو فرش صاف کرتے اور برتن دھوتے دیکھا ہے مگر بتاتے رہو، شور مچاتے رہے، سمجھاتے رہو، کون سنتا ہے۔ کم از کم وہاں بیٹھا تو کوئی بھی ہماری رائے پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہوتا جب تک کہ خود اگر اس دلدل میں پھنس کر نہ دیکھ لے۔ پھر دلدلوں نے کبھی کسی کو

چھوڑا ہے ؟۔

ادھر اس کا پڑھائی کی طرف کم اور مذہب کی طرف رجوع پھر کچھ زیادہ ہی بڑھنے لگا تھا۔ وہ رات کو بارہ بجے بھی سوتا تو صبح سردی ہو یا گرمی تین ساڑھے تین بجے اٹھ کر اور نہا دھو کر ساڑھے چار بجے شاہ جی کے گوردوارے جا کر باقاعدہ گوربانی کا کیرتن سننے لگا تھا۔ وہ اس پر بھی بس نہ کرتا بلکہ کالج جانے سے پہلے کی تمام تیاریوں تک کیسٹ لگا کر باقاعدہ گوربانی کا جاپ سُنتے جاتا۔ وقت بچانے کے لیے اس نے شیو کرنا بند کر دیا تھا مگر دراصل یہ اس کے سکھی دھرم کی طرف جھکاؤ کا پہلا زبردست رجحان تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے شیونگ سیٹ ایک فضول سی چیز کی طرح ایک کونے میں ڈال دیا۔

ماتا جی چاہتی تھیں کہ وہ پڑھ لکھ کر کام سے لگے تو وہ ایک سُندر سی بہو گھر میں لے آئیں مگر پون کی انتہائیں تو سنیاسیوں جیسی ہوتی جارہی تھیں ایسا کون ماں پسند کرے گی کہ اس کا بیٹا اتنی سی چھوٹی عُمر میں جوگ کی طرف مائل ہونے لگ جائے۔ مجبوراً انھوں نے اس کی دوسری زبردست خواہش کا خیال کرتے ہوئے اسے میرے پاس بھیجنا مناسب سمجھا اور میں نے بھی ان حالات میں اپنی نصیحتوں کے تمام ٹوکرے ایک طرف دھر دیئے اور اسے اپنے پاس ناروے بُلا لیا۔

یہاں آتے ہی خود اس نے پہلا کام یہ کیا کہ جلٹ کا ڈبل ایج شیونگ سیٹ خرید لایا۔ پھر اس نے فولکے ہائی اسکول میں داخلہ لے کر اپنی نارویجین زبان درست کی اور پھر گورمن کورس کے بعد ڈپلوما ان سوشل ہیلتھ کر کے نرسنگ کورس شروع کر دیا ساتھ ساتھ اس کا دھرم سے عشق بھی پھر جاگنے لگا۔ اور اس نے پھر داڑھی مونچھ بڑھانی شروع کر دی۔ اور وہی بہت سویرے اٹھ اٹھ کر گوربانی کے کیسٹ سننے لگا۔ ماتا جی اب پھر چاہنے لگی تھیں کہ پون واپس انڈیا آجائے۔ خود میری بھی یہی تمنا تھی اور پون بھی اس شرط پر واپس جانے پر رضامند تھا کہ ماتا جی دہلی کا مکان بیچ کر پنجاب منتقل ہو جائیں

——— اب ماتا جی نے لکھا ہے کہ میں اب اُسے واپس نہ بھیجوں اور اسے یہیں

سیٹل کرنے کی کوشش کروں۔ اور میں آج کل کے تمام حالات کو مدنظر رکھتا ہوا سوچوں میں ڈوبا ہوں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ سن تراسی اور چوراسی کچھ ایسے حالات بھی اپنے دامن میں لائیں گے کہ پون اپنے باپ جیسے بزرگ اور شفیق بڑے بھائی سے ڈرتا پھرے گا اور میں اپنے پیارے پیارے چھوٹے بھائی کو شک کی نظروں سے دیکھوں گا۔ اسے رات دو تین بجے اٹھ کر کچن کی ٹونٹی سے ٹھنڈا اور تازہ پانی نکال کر پینے کی عادت ہے۔ وہ جب بھی رات پانی لینے کو اٹھتا ہے تو میں اس کے پاؤں کی چاپ سے جاگ جاتا ہوں۔ اور اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی بتی جلا لیتا ہوں اور جب تک وہ کچن میں رہتا ہے۔ میں رضائی میں کسی خوف کی بے چینی سے ہلتا رہتا ہوں جیسے میں اسے جتانا چاہتا ہوں کہ میں سویا ہوا نہیں، جاگ رہا ہوں اور جب کسی کام سے میں اس کے قریب جاتا ہوں تو خود اس کی آنکھوں میں بھی کسی خوف کی پرچھائیاں مجھے صاف نظر آنے لگتی ہے۔

رہوں نہ رہوں میں کہانی رہے گی

وہ آگہی تھی

اس سے پہلے اس نے اسے فون کیا تھا "کہانی کار۔ میں نے تمہارے شب و روز، پڑھے ہیں۔ ان میں تو صرف روز ہی روز ہیں، شبیں غائب ہیں، کیا تم مجھے بھول گئے ہو؟"

اس نے رسالے میں چھپے اپنے شب و روز، پھر پڑھے تھے۔ واقعی اس کی زندگی میں ماں، بیوی، بچوں اور چند دوستوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ لڑکی نے کہا تھا۔ "تمہاری زندگی کی ساری راتیں ویران ہیں، تم نے اپنے پیار کو بھلا دیا۔ تم کیسے کہانی کار ہو؟"

اُن دنوں وہ ایک ناول لکھ رہا تھا۔ اور ناول میں اپنے ہیرو کو بہت کچھ دینا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی میں وہ جن نشاط کوشیوں سے محروم رہا تھا۔ اپنے ہیرو کو وہ سب کچھ دینا چاہتا تھا۔ کہانیوں میں بھی وہ اکثر اپنے کرداروں کی کئی محرومیوں کو پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لڑکی کی بات نے اسے بہت کچھ اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ادھر ناول تھا کہ گرفت ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک دن اس لڑکی نے پھر اسے فون کیا۔ "کہانی کار! تم کہیں باہر کیوں نہیں چلے جاتے۔ باہر ایک ہفتے کے لیے کاٹیج بک کروالو اور آرام سے ناول لکھو۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

اس نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی۔ لڑکی نے پھر اسے فون کیا اور کہا۔

"کرولانڈ کاٹیج بکنگ آفس فون کرو۔"

اٹینڈینٹ گرل نے اسے دو کاٹیجوں کی تصویریں دکھائیں جو خالی تھے اور ان کے ریٹ بھی مناسب حد تک کم تھے ایک تو بہت ہی پیارا سا، چھوٹا سا گھر تھا۔ آس پاس چیل اور دیودار کے اونچے اونچے درخت تھے۔ کھیت اور کھلیان تھے۔ تھوڑی دوری پر نیچے ایک جھیل اپنے شیشے میں بادلوں بھرا آسمانی عکس پیش کرتی تھی۔ لڑکی نے کاغذ پر نقشہ بنا کر اسے وہاں پہنچنے کا راستہ سمجھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کے پاس کار ہے نا۔ تو یہاں سے سانڈویکا تک ای اٹھارہ پر ڈرائیو کروگے۔ وہاں سے ہوتی فاکس تک ارسٹھ۔ آگے بروما تک نمبر سات۔ ایگے وال سے بائیں طرف ۲½ کلومیٹر جانا ہوگا۔ کاٹیج کے باہر گراسٹے ہے۔ اس پر لینڈ لارڈ تمہارا منتظر ملے گا۔"

اس نے دو تین بار نقشہ سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اسے معلوم تھا ایک بار کہیں بھی چوک ہو گئی تو وہ کہیں اور جانے کتنی دور پہنچ جائے گا کیوں کہ ایک بار غلط راستہ پڑ جاؤ تو کتنی کتنی دور واپس جانے کا کوئی موڑ ہی نہیں ملتا۔ ایک بار پھر اس نے راستہ سمجھنے کی کوشش کی تو وہ بولی۔ "میں چاہتی تھی تمہارے آنے سے پہلے تھوڑا سا گھر کو ٹھیک ٹھاک کر لیتی مگر خیر میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ راستہ مجھے معلوم ہے۔"

کرایہ کچھ زیادہ ہی تھا اور اسے تو اکیلے ہی وہاں رہنا تھا۔ اٹینڈینٹ گرل اسے بچوں کا کمرہ، ڈبل بیڈ، گارڈن، بچوں کے کھلونے، پارک اور نہ جانے کیا کیا سمجھا اور دکھا رہی تھی۔ اس نے کہا کہ اسے کوئی دوسرا ہٹ الاٹ کر دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ پانچسو کرونے تک کا۔

"اچھا، تم ان کا پانسو ہی دے دینا۔" گرل نے کہا۔

"اب تو خوش ہو نا؟" وہ بولی۔

کہانی کار نے نقشہ اور رسید لے کر ادائیگی کر دی تھی۔ آج اس کی چھوٹی سی رینو کار ہوا سے باتیں کر رہی تھیں اور سڑک اس کے کار کے پہیوں سے یوں جڑ گئی تھی جیسے ریلوے ٹریک ٹرین کے پہیوں سے جڑا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ کار میں لڑکی ایک نارویجین

گیت گنگنا رہی تھی جس میں دو محبت کرنے والوں کو راجہ نے مروا کر ایک کو چرچ کے ایک طرف اور دوسرے کو دوسری طرف دفن کروا دیا تھا۔ ان کی قبروں پر چیل کے دو اونچے اونچے درخت اُگ آئے تھے۔ جن کی شاخیں اوپر جا کر چرچ کی چھت کو کراس کر کے باہم مل گئی تھیں۔ داد دینے کو اس نے پہلو کی سیٹ پر بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا مگر وہ چونک کر سیٹ بیلٹ باندھنے لگی۔

"بھول گئی تھی۔ تم ناراض مت ہونا۔"

"حادثوں سے بچاؤ کے لیے بیلٹ تو باندھنی چاہیے مگر میں تو تمہاری میٹھی آواز پر تمہیں داد دینے جا رہا تھا۔" وہ بولا۔

وہ مسکرائی تھی۔ پھر اسے رد کرتے ہوئے بولی تھی۔ "بائیں طرف۔ وہ دیکھو۔ ایگے وال کا بورڈ ہے نا۔ ادھر صرف ۲½ کلومیٹر آگے۔" اس نے بہت تیزی سے موڑ کاٹا تھا تو وہ تنبیہہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ "آہستہ! اوہو تم بہت تیز چلاتے ہو۔ اب تو کچھ سبق حاصل کرو۔"

۲½ کلومیٹر جانے کے بعد ہی اسے گراشتے نظر آیا تھا۔ دروازے پر لینڈ لارڈ کھڑا کاٹیج کی چابیاں اپنی انگلی میں گھما رہا تھا۔ اس نے کار کے لیے کاٹیج کا گیٹ کھولا۔ چابیاں اسے پکڑاتے ہوئے پوچھا۔ "اکیلے ہونا؟"

کہانی کار کو محسوس ہوا جیسے وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ اس نے پوچھا۔ "کیوں؟"

"کچھ نہیں۔ بس یوں ہی پوچھا تھا۔" لینڈ لارڈ نے کہا تھا مگر کہانی کار کو محسوس ہوا تھا جیسے وہ کچھ چھپا رہا ہو۔

کار پارک کر کے اس نے کاٹیج کھولا۔ بہت خوب صورت سا گھر تھا۔ اندر گھستے ہی سائیڈ میں کپڑے ٹانگنے کا ہینگر تھا آگے چھوٹا سا کچن، ہر قسم کی کراکری۔ کانٹے چمچے چھریاں اور برتنوں سے بھرا ہوا۔ تین الیکٹرک ہیٹر تھے اور ایک طرف چھوٹا سا فرج بھی۔ بائیں طرف لونگ روم تھا جس کی سنٹر ٹیبل پر ایک گلدان میں گیرے گینا کے تازہ پھول اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ کچن کی ایک کھڑکی کراکری کی الماری میں سے ڈائننگ ٹیبل پر کھلتی تھی۔

دائیں طرف خوب صورت ہلکی نیلی ٹائیلون کا ٹائیلٹ کم باتھ تھا۔ ساتھ ہی ڈبل بیڈ سلپنگ روم۔ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھول کر اس نے دیکھا۔ یہ بچوں کا کمرہ تھا۔ جس میں ایک شیلف کھلونوں سے بھرا پڑا تھا۔ سائیڈ میں اوپر نیچے دو برتھ لگے تھے۔ چھوٹی سی میز اور ساتھ ہی دو منی کرسیاں تھیں۔

"سوچتی تھی، یہاں ہمارے بچے کھیلا کریں گے مگر......"

وہ دن بھر کی ڈرائیونگ سے تھکا ہوا تھا۔ ویسے بھی اتنے خوب صورت ماحول میں اندر بند ہو کر ناول لکھنے کا اس کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔ کار میں سے کپڑے نکال کر الماری میں لگانے، کھانے پینے کا سامان فرج اور کچن کی الماری میں رکھنے کے بعد وہ باہر نکل گیا تھا۔ جھیل بہت خوب صورت تھی۔ اس کے آس پاس ٹیڑھی میڑھی، اونچی نیچی ایک پگ ڈنڈی سی پکی سڑک گھومتی تھی جو سیر کرنے والوں اور دوڑ لگانے والوں کے کام میں رہتی ہوگی مگر آف سیزن کی وجہ سے اب سنسان پڑی تھی۔ ہر طرف موسم خزاں کے ہاتھ پتوں کو زرد اور لال رنگ سے پینٹ کر رہے تھے۔ ہواؤں میں ہلکی سی خنکی اور مٹھاس تھی۔ اس نے سوچا، ایک چکر تو پورا کر ہی لوں جھیل کے آس پاس۔

"میں نے سوچا۔ تم آج کل یہاں آجاؤ تو بہت اچھا ہوگا۔ سیاح جا چکے ہیں۔ ہم اور تم ہوں گے۔ خوب باتیں ہوں گی۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" کہانی کار نے نظریں گھما کر اسے دیکھا مگر اس کی آنکھیں کوئی وجود نہیں دیکھ پائی تھیں لیکن اس کے کانوں میں مندر کی گھنٹیوں جیسی آواز گونجتی رہی تھی۔ سارا راستہ گونجتی رہی تھی۔ وہ کیسی تھی۔ اسے تو بہت اچھی لگتی تھی۔ کہانی کار کے سپنوں سے بڑھ کر اور کون خوب صورت ہوگی۔

کاٹیج میں اس نے کہانی کا مسودہ میز پر رکھا، قلم ہاتھ میں لیا، لیکن ذہن میں ایک بھی لفظ نہیں آرہا تھا۔

"آج آرام کر لو۔ تھکے ہوئے ہو۔"

وہ صوفے ہی پر لیٹ گیا۔ "بیئر پیو گے، چائے، کافی یا وہسکی؟"

اس کی خاموشی پر وہ بولی تھی۔ "کافی تمہیں پسند نہیں، میں جانتی ہوں۔ ٹھنڈی بیئر ٹھیک نہیں رہے گی؟"

اس نے بیئر کا ایک بڑا گھونٹ بھرا تھا۔ جھاگ نے اس کے اوپر کے ہونٹ پر سفید سفید مونچھیں بنا دی تھیں۔ کھنکتی ہوئی ہنسی میں وہ بولی تھی۔ "بالکل اسی طرح پیتے ہو۔ ذرا بھی نہیں بدلے؟"

بیئر ختم کر کے کچن کی طرف وہ گیا تھا تو وہ بولی تھی۔ "چنے کی سبزی بنا دی ہے میں نے۔ پراٹھے بھی پڑے ہیں۔ گرم کر لو۔ تم کہتے تھے نا، ہیں اب وہ ہندوستانی نہیں رہا۔ جو کھا کرتے ہیں۔ میں نے تو پانی بھی کبھی ہاتھ سے نہیں پیا۔ پوچھو نوکر جا کر پلاتے رہے ہیں تو بیوی، بیٹی، بہن یا ماں کا نام لے دیں گے جیسے وہ گھر کی باندیاں ہوں۔"

وہ سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ دل کہتا تھا۔ اس نے یہ مکالمے کبھی کہے تھے؟ کب کہے تھے؟ اسے کچھ نہیں یاد آ رہا تھا۔ اسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر وہ بولی تھی۔ "چھوڑو بیتی باتوں کو۔ میں سارا دن کا کچن صاف کرتی رہی ہوں۔ تھکی ہوئی نہ ہوتی تو سب کچھ کرتی۔ سچ! مجھے بہت خوشی ہوتی ہے تمہارا کام کرتے ہوئے۔"

کھانا کھاتے ہوئے جب اس نے چنوں کی سبزی کا چٹخارہ لیا تھا تو وہ زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"یاد ہے۔ میں نے پوچھا تھا۔ تمہیں چنے کیوں زیادہ پسند ہیں تو تم نے ایک لطیفہ سُنایا تھا۔ چنا بھگوان کے حضور فریاد لے کر پیش ہوا تھا۔ میں پیدا ہوتا ہوں تو لوگ میرے پتوں کا ساگ بنا کر کھانے لگتے ہیں۔ ابھی ہرا اور کچا ہوتا ہوں تو بھی نہیں چھوڑتے۔ ذرا پکتا ہوں تو بھوننے لگتے ہیں۔ پک جاتا ہوں تو روٹیاں پکاتے ہیں۔ دالیں بناتے ہیں، پکوڑے تلتے ہیں۔ اور نہ جانے کن کن طریقوں سے کھاتے ہیں۔ بھگوان نے کہا تھا۔ بھئی ذرا پرے کھڑے ہو۔ میرے منہ میں پانی آ رہا ہے۔ کہیں تمہیں کھا نہ جاؤں!"

وہ ہنستی گئی تھی جیسے پہاڑی ندی پتھروں سے ٹکراتی گنگناتی نیچے اترتی ہے۔ "میں چنوں کے پانچ پیکٹ لے آئی ہوں۔ مجھے پتہ تھا تمہیں چنے بہت پسند ہیں۔"

"سو تو ہیں۔" اس نے کہا تھا پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تھا، اس نے کس کے جواب میں کس سے کہا تھا۔

"کسی بھی طرح کھائے جائیں۔ نئی نئی شادی کے بعد میاں بیوی کے لیے چنے بہت اچھے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں نا۔ ۔ ۔ ۔" آگے کچھ کہتے کہتے وہ خاموش ہوگئی تھی جیسے نئی دلہن کچھ کہتے ہوئے شرما اور لجا جاتی ہے۔

لکھنے سے بھاگنے کے لیے اس کا جسم کئی بہانے ڈھونڈتا تھا مگر دوسروں کا لکھا اُسے پڑھنا ذرا بھی مشکل نہ معلوم ہوتا تھا۔ لکھتے وقت نیند کی دیوی جو اس کی آنکھوں پر ٹھنڈے ٹھنڈے روپہلے پنکھ پھیلا دیتی تھی، پڑھتے وقت دور کسی انجانی وادی کی طرف چل جاتی تھی۔ وہ بہت آسانی سے بہت دیر تک رات کو پڑھتا رہتا تھا۔ اس دن بھی وہ بہت دیر تک پڑھتا رہا۔ پھر وہ بولی "کافی پڑھ لیا ہے۔ اب آؤ چلو سو جائیں۔"

اور یہ ایک فقرہ جیسے کوئی جادوئی منتر تھا کہ سنتے ہی نیند اس کے ذہن کے قلعے کی دیوار پر چاروں طرف سے یلغار کرنے لگی اور نہ جانے کب وہ سو گیا۔ وہ سوتا رہا، جاگتا رہا۔ جاگتا تو محسوس ہوتا جیسے کوئی ساتھ سو رہا ہے۔ ہاتھ بڑھا کر دیکھتا تو کوئی نہ ہوتا۔ سوتا تو پھر عورت کے جسم کے ابھاروں کا لمس کبھی پیٹھ پر، کبھی چھاتی پر گدگدی کرنے لگتا پھر نیند آجاتی، پھر خواب آنے لگتے مگر یہ کیسے خواب تھے۔ جن میں ہر چیز واضح اور روشن تھی۔ خوابوں کی پرچھائیوں جیسی نہ تھی۔ صبح اٹھا تو محسوس ہوا جیسے سب کچھ ہوا ہے۔ جو ہونا چاہیے۔ جسم جیسے مٹھاس کے سمندر میں غلطاں تھا۔

وہ ابھی آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ وہ بولی تھی "اٹھو بیڈ ٹی لے لو۔"

غسل خانے میں مناسب ڈگری تک گرم پانی سے بھرا ٹب اسے تیار ملا تھا۔ "کیوں ٹھیک ہے نا؟" اس نے پوچھا تھا۔

"تمہیں کیسے پتہ ہے کہ میں اتنا ہی گرم پانی پسند کرتا ہوں۔" اس نے پوچھا تھا تو جواب میں ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگے تھے۔

"مجھے اگر تمہارے ہی ٹیسٹ کا پتہ نہ ہو تو مجھے اپنا بھی پتہ نہ ہوگا۔"

نہا دھو کر وہ کچن کی طرف بڑھا تھا۔ "پہلے سیر کر آیا کرو۔ آج پہلا دن ہے اس لیے معاف کرتی ہوں۔" وہ تھوڑی دیر خاموش رہی تھی جیسے اپنی بات میں وزن پیدا کر رہی ہو پھر وہ ہولے ہولے مسکرانے لگی تھی۔

دوسرے دن واقعی بیڈ ٹی اور حاجات ضروری سے زیادہ اس نے اسے کچھ بھی نہیں کرنے دیا تھا۔ "بس اب نکل چلو۔ بہت سہانا وقت ہے۔"

درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ ہر طرف آوازوں کا سمندر رواں تھا۔ اس میں کتنی لہریں تھیں۔ کتنے رنگ تھے۔ نور تھے۔ ہر پرندے کے گلے میں سروں کے کتنے الگ الگ تار آویزاں تھے جو صبح کی ہوا کے ذرا سے لمس سے بج اٹھتے تھے۔

صبح کی سیر کے بعد وہ گھر آئے تھے۔ تیار ہوئے تھے۔ پھر کھانے کی باسکٹ ساتھ لیے وہ کار پر دور کسی جھیل کے کنارے جا بیٹھے تھے یا کسی پہاڑی ندی کی چٹانوں پر۔ باسکٹ میں سب کچھ تھا۔ فروٹ، سبزیاں، پراٹھے، حلوہ بادام۔ اس نے ایک سیب کھایا تو ٹوکری میں دو کم ہو گئے۔ روٹی وغیرہ بھی آدھی غائب ہو جاتی تھی جیسے کوئی اس کے ساتھ بیٹھا اپنا پورا حصہ کھا رہا ہے۔ پھر وہ پتھروں پر ریسٹ میٹ بچھا کر لیٹ گیا تو وہ لال، نیلی اور اودی بیر بیر توڑ توڑ کر لاتی گئی اور اس کے لبوں میں رکھتی گئی۔ وہ ان کا رس چوستا رہا تھا بند آنکھوں میں سورج کی شعاؤں کا رنگین کھیل اسے اپنے بند پپوٹوں میں محسوس ہوتا رہا تھا۔ شام کی چائے کے بعد وہ پھر اسے سیر کرانے لے گئی تھی۔

"دیکھو سستی چھوڑو۔ مزے لو۔ یہ موسم چند روزہ ہے پھر برف باری شروع ہو جائے گی۔"

اس کے چھ دن ایک سلسلے اور روٹین سے گزر گئے تھے۔ وہ خوش تھا بہت خوش! اس کا بہت اچھا وقت گزرا تھا، مگر دکھ کی پتلی سی لکیر بھی کہیں کانٹے سی محسوس ہوتی تھی۔ پورے چھ دن گزر گئے تھے وہ ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا تھا۔

"تم لکھو گے کچھ نہیں؟" اس نے پوچھا تھا۔

"تم کہاں لکھنے دیتی ہو۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

"اچھا تم بیٹھو۔ لکھو۔ میں تمہیں بالکل ڈسٹرب نہ کروں گی۔ وعدہ!" وہ بولی تھی۔

پھر زور سے ہنستے ہوئے اس نے کہا تھا۔ "ہاں بیچ میں گرم گرم چائے کا ایک پیالہ ضرور پہنچانے آؤنگی۔"

اس کے پاؤں کی آہٹ سے چونک کر جب اس نے ناول کا جائزہ لیا تو آدھے سے زیادہ مکمل ہو چکا تھا نہ جانے کس جادوئی طاقت نے اس سے اتنا زیادہ، اتنے تھوڑے وقت میں لکھوا لیا تھا۔ اس نے بالکل کچھ بھی نہ کہا تھا۔ صرف چائے کا پیالہ آگے رکھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ اور جب وہ پھر آئی تو ناول مکمل ہو چکا تھا۔

"چنے کا حلوہ ہے۔ میں نے بادام اچھی طرح ڈالے ہیں۔ تم نے اپنا سر خالی کر لیا لکھ لکھ کر۔" وہ پھر ہنسنے لگی تھی۔

ساتویں دن جب وہ جانے کے لیے سامان پیک کرنے لگا تھا تو اسے محسوس ہوا جیسے ہر کام میں کوئی ہاتھ بٹا رہا ہے۔ وہ ایک چیز باندھتا ہے تو دوسری چیز ساتھ بندھی ملتی ہے۔ سامان ڈکی میں رکھ کر اس نے کار باہر نکالی تو وہ اُسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔

"واپس آؤ گے نا؟"

"یہ تو تم پر منحصر ہے۔" اس نے جواب دیا تھا۔ مگر اس کے دل نے کہا تھا جھوٹ مت بول!

"میں تو کہوں گی۔ مت جاؤ۔ یہیں رہ جاؤ میرے پاس! اب میں اور زیادہ دیر اکیلی نہیں رہ سکتی۔" وہ بولی تھی۔

"اچھا ذرا ڈاک خانے جا کر لیٹر تو پوسٹ کر آؤں۔" اس نے بہانہ تراشا تھا۔

"لوٹ آؤ گے؟"

"ہاں۔" وہ کار میں بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔

"اچھا تو بیلٹ باندھ لو راستہ چکردار ہے۔" وہ بولی۔

ڈاک خانہ کے ساتھ ہی گھر کی روزمرہ کی استعمال کی چیزوں کا اسٹور تھا۔ وہاں اس

نے علاقے کی جھیلوں کے خوب صورت رنگین کارڈ خریدے۔ ان پر اس نے سب دوستوں اور رشتہ داروں کو لکھا۔ "یہ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ دل چاہتا ہے یہیں رہ جاؤں۔"

"تو رہ جاؤ نا۔ کس نے منع کیا ہے؟" یہ کس نے کہا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا تھا۔ شاید اس کے کان بجے تھے۔

ڈاک خانے میں ٹکٹ لگانے کے لیے اس نے کارڈ کھڑکی میں رکھے۔ اجنبی کو دیکھ کر ڈاک بابو بولا۔

"آپ کہاں ٹھہرے ہیں؟"

"ایمرسن کے ہٹ نمبر ۶۵ میں۔"

"ہائیں، ہٹ نمبر ۶۵ میں؟" بابو کا منھ کھلا رہ گیا۔

"ہاں۔ مگر اب تو ایک ہفتہ رہ کر واپس جا رہا ہوں، کیا بات ہے؟"

"وہ ہٹ تو کبھی بک نہیں ہوتا۔"

"کیوں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "سارے علاقے میں وہ ہٹ سب سے زیادہ خوب صورت ہے اور بہت اچھی جگہ پر واقع ہے۔"

"وہاں ایک لڑکی کی روح رہتی ہے جو آج سے تیس سال پہلے ایک لڑکے کے ساتھ یہاں آئی تھی مگر کار حادثے میں مر گئی تھی۔ وہاں رہنے والوں کو ڈراؤنی آوازیں اور بھیانک سپنے آتے ہیں۔" بابو بولا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "مگر مجھے تو بہت پیاری پیاری میٹھی میٹھی آوازیں اور سجیلے سپنے آتے رہے ہیں۔"

کارڈوں پر ٹکٹ لگا کر باہر نکلا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ اور موڑ کاٹ کر وہ مین روڈ پر پہنچ گیا۔ ڈاک بابو اپنی کھڑکی سے دھند بھری سڑک پر اس کی جاتی ہوئی کار کی لال بتیاں دیکھتا رہا جو لمحہ بہ لمحہ ٹوٹے ستاروں کی طرح مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔

"پردیسی۔ تم نے تو کہا تھا۔ واپس آؤں گا!" آواز اس کے پیچھے گونجتی رہی تھی۔ ابھی ڈاک بابو کی آنکھوں سے ستاروں کی لکیریں پوری طرح مٹی بھی نہ تھیں

کہ اُدھر سے آکر ایک کار ڈاک خانہ کے سامنے رُکی اور ایک شخص باہر نکل کر اس کی کھڑکی کی طرف لپکا۔ ”ابھی اِدھر سے ایک کار گئی ہے نا؟“ اس نے کہا۔ ”موڑ کی پہاڑی سے اس کی ٹکر ہو گئی ہے۔ کار تو بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے مگر آدمی اندر سیٹ بیلٹ سے بندھا پڑا ہے۔ بظاہر اسے کوئی چوٹ نہیں آئی مگر وہ مر چکا ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں۔ ایمبولینس کی ضرورت نہیں۔ صرف پولیس کو فون کر دو۔“

بندی

"طلاق، طلاق، طلاق!"

کل شام سے ہی یہ الفاظ میرا پیچھا کر رہے تھے جب میں نے اسے اداس اور پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا۔ رات کو خواب میں بھی یہ تینوں الفاظ میرے کانوں میں بجتے رہے تھے۔ ان لفظوں کی گونج تو میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی تھی مگر میرا خواب کوئی صورت اختیار نہ کر سکا تھا۔ صبح جب میں اٹھ کھڑا ہوا تو میرے تھکے ہوئے ذہن کو چند لمحوں کے لیے قرار آگیا تھا۔ دوبارہ کی کچی نیند میں میرے خواب نے میری خواہش کے مطابق واضح صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی، "میں جا رہی ہوں، اب ایک پل بھی تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

پھر خواب میں ہی یہ چھوٹا سا مکالمہ سکڑ کر اور بھی مختصر ہو کر ان تین لفظوں میں سمٹ گیا تھا، "طلاق، طلاق، طلاق!"

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا کہ اب خواب کی تعبیر دیکھنی باقی تھی۔ میں نے کار نکالی۔ ٹیلی فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسے موقعوں پر آنے کی پیشگی اطلاعیں نہیں پہنچائی جاتیں، بس پہنچ جایا جاتا ہے۔ وہ لوگ گھر میں ہی تو ہوں گے۔ ہمارا آپسی رشتہ کوئی زیادہ بڑا نہیں۔ بس ایک عرصے صرف گاہک اور دکان دار کی میٹھ بولی کا ہے یا ہم وطنی کا، جو پردیس میں اتنا بھی کافی نزدیکی محسوس ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ چلی جائے ہمیں تعزیت کے لیے پہنچ جانا چاہیے

وہ گھر میں اکیلی تھی اور سامان باندھتے ہوئے جانے کی تیاریاں کر رہی تھی اور آہستہ آہستہ روئے بھی جا رہی تھی۔ ہم نے اس کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو خود ہی اس نے کام سے ہاتھ کھینچ لیا جیسے منتظر ہو کہ آج کوئی اس کے ہاتھ کا سارا کام سنبھال لے تاکہ وہ پل بھر کے لیے اپنی سوچوں کی دنیا میں گم ہو سکے۔ وہ صوفے پر جا بیٹھی۔ یادیں اسے رلا رہی تھیں مگر رلاہٹ اسے ایک سکون بھی بخش رہی تھی۔ تسلی دینے کو میری بیوی توشی نے اس کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا تو وہ اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ توشی نے پوچھا، "دھیر صاحب کہاں ہیں؟"

تھوڑی دیر صبر آنے کے بعد اس نے کہا، "وہ تو دکان چلے گئے ہیں۔ کہہ گئے ہیں، میں آ جانا۔ میں آدھے گھنٹے کے لیے دکان بند کر کے تمہیں ایر پورٹ چھوڑ آؤں گا۔"

میں سوچنے لگا کہ کیا وہ باپ کی موت پر رو رہی ہے یا اپنے آدمی کے ظالمانہ اور خود غرضانہ رویے پر۔

لڑکی بہت حسین ہے اور میاں بیوی کی عمروں میں بھی بہت فرق ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی یہاں آتے ہیں جو چند سال لگ لپٹ کر اور دن رات ایک کر کے کام کرتے ہیں اور جب پیسہ سامنے کے دروازے سے داخل ہونے لگتا ہے اور جوانی پچھلے دروازے سے کھسکنے لگتی ہے تو اپنے مُلک جاتے ہیں۔ ہاں یہ ان پڑھے اور جاہل لوگ وطن کے لیے لفظ ملک کو بگاڑ کر مُلک ہی کہتے ہیں۔ اور اپنے سے آدھی عمر کی کسی حسینہ کو بیاہ لاتے ہیں۔

ہم جب بھی ان کی کھانے پینے کے سامان کی دکان پر جاتے ہیں۔ میں اسے جیسے رانی بنا کر رکھوں گا، کہہ کر اس کے میاں نے اس کے ماں باپ سے مانگا ہو گا، کو مرچ مسالوں میں لت پت گلے گلے تک کام میں ڈوبے دیکھتا ہوں تو سوچوں میں ڈوب ڈوب جاتا ہوں کہ کب کوئی شہزادہ آئے گا اور اسے اس جن کے پنجے سے آزاد کرائے گا۔ ہو سکتا ہے میرے اندر کے پیش بین ادیب نے ان مظالم کو پیشگی دیکھ لیا ہو مگر کل شام تو مجھے واقعی اس شخص کا بھوت روپ صاف نظر آ گیا۔

کبھی کبھی میری بیوی کو آفس میں دیر ہو جائے تو وہ مجھے فون کر دیتی ہے کہ دفتر سے

نکلتے ہوئے راستے سے اسے بھی پک اپ کرتا چلوں۔ اسی حساب سے آج کار میں وہ بھی میرے ساتھ تھی۔ ہم جب خندیری سے نکلنے لگے اور بائیں طرف اس کی دکان پر میری بیوی کی نظر پڑی تو اسے گھر کی بیسیوں چیزیں یاد آگئیں۔ کار پارک کر کے ہم اندر پہنچے اور ضرورت کا سامان خرید کر ٹوکری کاؤنٹر پر رکھی تو اس کا میاں ہمیں لائن میں سب سے آگے ہونے کے باوجود نظر انداز کر کے پیچھے والے گاہکوں کو بھگتاتا گیا۔ ایک دو تین چار، جب آٹھ دس گاہک بھگت گئے، تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا "رانا صاحب۔ آپ تھوڑی دیر رک جائیے۔"

میں لحاظ داری میں چند پل اور رک گیا مگر وہ نہ رک سکا۔ بولا، "آج میری بیوی کا باپ گزر گیا ہے۔ ابھی انڈیا سے ٹیلی فون آیا ہے۔ وہ اندر بیٹھی رو رہی ہے۔"

"اور تم اسے رانی بنا کر رکھنے کے دعوے کرنے والے باہر دکان کھولے بیٹھے ہو" میرے اندر کے ادیب نے سوچا۔ دکان تھی کہ بہت بڑا اسٹور۔ اندر جانے کتنے خانے تھے جو خالی بوتلوں، خالی ڈبوں الم غلم سامان، الماریوں، ریک، کریٹ، پیٹیاں، ڈبوں اور بیسیوں قسم کے سامان سے بھرے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ہم اسے ڈھونڈنے لگے۔ خانہ خانہ ڈھونڈتے ہوئے آخر ہم نے اسے پا ہی لیا۔ وہ ایک ڈبہ نما کیبن میں بیٹھی سسک رہی تھی۔ میری بیوی نے اس کا سر چھاتی سے لگایا تو وہ پھپھک پڑی۔ ہم نے ہمیشہ اسے خاموشی سے کام کرتے دیکھا تھا۔ خاموش حسن، کہیں کوئی فریاد نہیں، گلہ شکوہ نہیں۔ آج وہ رو رہی تھی۔ فریاد کناں تھی، "میں چار سال سے ماں باپ سے نہیں ملی۔ مشین بن کر رہ گئی ہوں۔ باپ لکھتا تھا، مر رہا ہوں۔ ایک بار مل جاؤ مگر یہ جانے دیتے تو جاتی۔ کہتے تھے دکان کون چلائے گا۔ دکان تو چل رہی ہے، صرف میرے باپ کی سانس بند ہو گئی ہے۔"

اس کی سسکیاں اس کی آواز دبا دیتی تھیں مگر میری بیوی سے حوصلہ پاتے ہی وہ پھر شروع ہو جاتی تھی۔ "ہم پانچ بہنیں ہیں۔ میں اٹھارہ سال کی تھی جب باپ نے بیاہ دی تب یہ چالیس کے ہوں گے۔ بارہ سال ہو گئے شادی ہوئے۔ بس ایک بار جانے دیا تھا بہت پیسہ آتا ہے دکان سے مگر انہیں اور، اور زیادہ کی رٹ لگی رہتی ہے۔ میرے باپ کو

تو کوئی جلدی نہیں تھی۔ ماں نے ہی ضد پکڑ لی۔ بڑی آگے سے ہٹے گی تو دوسریوں کی بھی باری آئے گی اور میں آگے سے ہٹ گئی، ایسی ہٹی کہ سالوں ایک دوسرے کے منہ کو ترس گئے۔"

وہ آنسوؤں کی جھڑی لگائے روئے جا رہی تھی اور اس کی آٹھ سالہ ننھی سی بچی پاس کھڑی نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کرے۔ میری بیوی کے پانی لا کر اس کے منہ پر چھینٹے مارنے آدھا گلاس پلانے، اور چند تسلی آمیز الفاظ کہنے پر اسے ذرا سا صبر آیا۔ مگر پھر اسے اپنے باپ کی کوئی بات یاد آ جاتی" اور وہ پھپھک اٹھتی۔" میں پیچھے سے جا کر ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دوں گی۔ کہوں گی پاپا میں آ گئی۔"

"مگر ... مگر ..." بندھ پھر ٹوٹ جاتا۔ "کس سے کہوں گی۔ راکھ کے ڈھیر سے۔"

دکان میں رش بڑھ گیا تھا۔ بچی باپ کا ہاتھ نہیں بٹا پا رہی تھی۔ باپ نے اسے اندر بھیج دیا۔ وہ آئی اور ماں سے کہا۔ "ممی۔ پاپا بلا رہے ہیں۔"

وہ اٹھی اور دوسرے کاؤنٹر پر جا کر گاہکوں کو بھگتانے لگی۔ یہاں دکان دار کو گاہک کے ساتھ مسکرانا پڑتا ہے۔ بوڑھوں کے تھیلے وغیرہ بھرنے میں بھی مدد کرنی پڑتی ہے مگر آج وہ مسکرانا بھول گئی تھی۔ اس کے چہرے پر غم کی گہری بدلیاں اتر آئی تھیں۔ ایک بڑھیا اسے تھیلے باہر اپنی کار تک پہنچانے کے لیے ساتھ لے گئی۔ باہر اسے از حد اداس دیکھ کر وجہ پوچھی اور اسے سینے سے لگا کر اور سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر تسلیاں دینے لگی۔ ماں جیسی گود میں اس کے بند پھر ٹوٹ گئے۔ واپس آ کر وہ پھر اندر کیبن میں جا بیٹھی۔ دکھ پھر اسے رلانے لگا۔ ہم اس کے پاس اندر جا کھڑے ہوئے۔ میری بیوی نے پوچھا۔ "تمہارے پتا بیمار تھے؟"

بہت دیر بعد سسکیوں کے درمیان وہ بولی۔ "نہیں جی۔ بس ذرا بلڈ پریشر تھا۔ عمر بھی کوئی خاص زیادہ نہیں تھی۔"

"جا رہی ہو؟"

"ہاں کل کے لیے ٹکٹ بک کروا دی ہے۔ چاہتی ہوں بچی بھی ساتھ جائے مگر یہ مان نہیں رہے۔ کہتے ہیں اس کی پڑھائی خراب ہو گی۔" رلاہٹ نے پھر اس کی آواز دبا ڈالی۔ اس کا گلہ بھر بھر آتا رہا۔ "صاف بہانہ ہے۔ ٹکٹ کے پیسے بچانا چاہتے ہیں۔ آٹھ

سالہ بچی کو ساتھ دکان پر لگانا چاہتے ہیں۔"

"گھر والوں کو آنے کی اطلاع کر دی ہے؟ کہیں وہ ... ۔" میری بیوی نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"وہاں کون تین دن لاش کو روکتا ہے۔ فون کیا تھا ایک پڑوسی کے ہاں۔ کہہ رہے تھے، اطلاع کر دوں گا۔" وہ بولی۔

"توشی تم فون کر دو۔" میں نے بیوی سے کہا۔ "پوچھو تو اطلاع ہو گئی؟"

میز پر ہی فون پڑا تھا۔ توشی نے ریسیور اٹھا کر نمبر ملایا۔ وہ بہت دیر تک کوشش کرتی رہی مگر کنکشن نہ مل سکا۔ اس کا خاوند اندر آ گیا۔ بولا "آدمی پکا ہے۔ اطلاع کر دی ہوگی۔" پھر وہ بیوی سے بولا "تم باہر چلو، کام میں لگو گی تو دل بہلے گا۔"

ہم دونوں سوچ رہے تھے۔ کیا وہ دکان کے بقایا دو گھنٹے باہر بورڈ لگا کر کہ گھر میں موت ہو جانے کے کارن دکان بند کی جا رہی ہے، اچھی نہیں کر سکتا۔ بیوی سے چند تسلی کے الفاظ نہیں کہہ سکتا۔

اندر مشین نے گاہکوں کی ڈالی ہر قسم بیئر، کولا، سولو، سیون اپ وغیرہ کی بوتلیں ڈھیر لو اگل دی تھیں، جنھیں صبح ہی کمپنی کے ٹرک نے لینے آنا تھا۔ بچی انھیں کریٹوں میں بھر رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ وہ بار بار مجھ سے کہتا "رہنے دیجئے رانا صاحب۔ ہو جائے گا۔"

اس کا مجھے روکنا، مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔ وہ یہ سارا بھاری کام بچی سے کروانا چاہتا تھا۔ دکان بند کرنے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ اس نے ہمیں خود ہی روکا ضرور تھا مگر اب وہ چاہتا تھا کہ ہم چلے جائیں شاید ہم اس کے کام میں مخل ہو رہے تھے مگر اس کی بیوی کو ہماری موجودگی راحت بخش رہی تھی۔ اس نے میری بیوی کا ہاتھ دبا کر رکنے کی درخواست کی تھی۔

چھ بجے گئے۔ ہم نے سوچا۔ اب دکان بند ہو گی تو ہم بھی ان کے ساتھ باہر نکل جائیں گے۔ انھوں نے ٹھیک چھ بجے اندر سے دروازہ بند کر دیا تھا مگر ساتھ ہی میاں نے دن

بھر کا حساب کتاب سنبھال لیا تھا اور بیوی صابن بھرے پانی کی بالٹی اور برش سے فرش دھونے لگی تھی۔ میرے اندر پھر ایک ہمدردی کی لہر سی اٹھی اور میں نے اس سے برش لے کر فرش دھونا شروع کیا۔ وہ پھر بار بار مجھ سے برش چھین لیتا۔ "آپ رہنے دیجئے۔ وہ جلدی ختم کرلے گی۔ آپ کو دیر لگے گی۔" وہ بہانہ بناتا۔

اس کے آنسو بالٹی میں گر رہے تھے۔ وہ کپڑے کے برش کو پانی میں بھگوتی، ڈنڈے کے شکنجے میں فکس کرتی، فرش دھوتی اور روتی جارہی تھی۔ میں نے پھر اس کے ہاتھ سے برش لے لیا۔ میاں نے میری طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے روکے یا مجھ سے کچھ کہے۔ میں نے کہا، "یہاں کوئی نوکر تو رکھ نہیں سکتا۔ گھر میں ہر کوئی اپنے فرش خود ہی دھوتا ہے۔ آپ اسے فی الحال کچھ مت کہیں۔ میں ابھی دھوئے دیتا ہوں۔"

اب حالت یہ تھی کہ میاں چاہتا تھا کہ ہم چلے جائیں اور بیوی کی آنکھیں بار بار رک جانے کی درخواست کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ آخر میاں سے رہا نہ گیا تو وہ بولا، "رانا صاحب۔ ہمیں تو نو بج جائیں گے۔ حساب کتاب کرنا ہے، بکھرا ہوا سامان سمیٹنا ہے۔ کل کے لیے پیکٹ بنانے ہیں۔ بہت کام ہے۔ آپ جاکر آرام کریں۔"

یہ دراصل ہمیں چلے جانے کا اشارہ تھا۔ اب اس صورت کیسے کوئی رک سکتا۔

وہ گھر میں اکیلی تھی۔ میاں دکان پر جاچکے تھے۔ ہم نے اسے تیاری کرنے میں مدد کی۔ غم نے اس کے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔ "کیسے جاؤ گی؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"انھوں نے کہا ہے دکان پر آجانا، وہاں سے ایرپورٹ پہنچا دوں گا۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ چلیے ہم دکان پر پہنچا دیتے ہیں۔" میری بیوی نے کہا۔

دکان پر پہنچے تو میاں نے کہا، "رانا صاحب، بہت بہت شکریہ۔ آپ انھیں لے آئے۔" پھر کچھ دیر رک کر پوچھا، "آپ کدھر جائیں گے؟"

"گھر۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"ارے یاد آیا۔ آپ تو ادھر ہی رہتے ہیں۔" وہ بولا، "ذرا ادھر انھیں بھی ایرپورٹ چھوڑ دیں گے؟" یہ سوال کم، درخواست زیادہ تھی، جس میں اس کی اپنی دکان بند نہ کرنے

کی خواہش بھی پنہاں تھی۔" عجیب ملک ہے۔ سسرے لیسے قانون ہیں کہ دو منٹ کے لیے دکان بھی بند نہیں کر سکتے۔" اس نے اپنی ساری خود غرضیوں کا الزام نئے ملک اور اس کے قوانین کے سر تھوپ دیا۔

ہم نے اسے ایرپورٹ پہنچا دیا۔ واپسی پر سارا راستہ میرے ذہن میں سوچوں کی مکھیاں بھنبھناتی میرے خواب کی تعبیر ڈھونڈتی رہیں۔ اب وہ کسی صورت واپس نہیں آئے گی اس کا طلاق نامہ آئے گا مگر تیسرے ہی ہفتہ جب ادھر سے میرا گذر ہوا اور میں دکان میں گھسا تو میں نے دیکھا۔ وہ کاؤنٹر پر کھڑی تھی۔ واضح تھا کہ وہ پروگرام سے چند دن پہلے واپس آ گئی تھی کیوں کہ اب نہ صرف اسے اپنی چھوٹی بہنوں کے آگے سے ہٹنا تھا۔ بلکہ اپنی بیٹی کی زندگی کے آگے بھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنی تھی۔

بھوک

میں صبح اٹھتے ہی ایک پیالہ بیڈ ٹی پیتا ہوں۔ بارہ بجے دفتر جانا ہوتا ہے اس لیے دس بجے دلیہ گرم گرم چائے کے ساتھ جیم اور ٹوسٹوں کا ہلکا ناشتہ کرتا ہوں۔ دفتر میں تھوڑا سا فروٹ اور شام کو بس دو روٹی اور ایک لذیذ سا سالن میری تسلی کر دیتا ہے۔ جس دن بیوی ساتھ سلاد کی پلیٹ بنا دیتی ہے یا لسّی کا ٹھنڈا میٹھا گلاس یا خود میں ایک پیگ وہسکی یا بیئر کی ایک بوتل کھول لیتا ہوں تو عیاشی ہو جاتی ہے۔ میری بیوی کو شکایت ہے کہ میری بھوک ٹھیک نہیں مگر سچ یہ ہے کہ مجھے بھوک بہت تیز لگتی ہے مگر جب اپنے کھانے کے مندرجہ بالا مینو کو دیکھتا ہوں تو مجھے بھی شک ہونے لگتا ہے کہ شاید میری بھوک کم ہے۔

ہمارے ہاں اکثر شام کو کسی نہ کسی بہانے دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح ہمیں بھی دوستوں کے ہاں مدعو کیا جاتا ہے۔ وہاں بھی سب کو میری بھوک کی کمی کی شکایت رہتی ہے ایسی دعوتوں میں مہمانوں کو پہلے کوئی ہاٹ یا کولڈ ڈرنک پیش کی جاتی ہے ساتھ ہی بھنے ہوئے کاجو، پستہ یا چپس وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ کوئی دو اڑھائی گھنٹے گپ شپ ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد ہاؤس وائف میاں کو کوئی اشارہ کرتی ہے اور وہ تالی بجا کر سب کو اپنی طرف متوجہ کرتا، بڑے مؤدبانہ انداز میں ڈائننگ ٹیبل پر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر ٹیبل پر آٹھ کرسیاں ہوں اور کھانے والے بھی آٹھ افراد ہوں تو وہ سب کو ان کی کرسیاں

بتا بتا کر بٹھاتا جاتا ہے۔ بصورت دیگر بوفے سسٹم کی طرح وہ سب کو ایک ایک پلیٹ اور نیپکن پکڑاتا ہوا، کھانے کی ڈونگوں کی طرف خوش آمدید کہتا جاتا ہے۔ کھانے میں چاول پراٹھے، تنوری روٹیاں یا نان کے علاوہ چار پانچ قسم کے سالن، رئیتا، گوشت اور سلاد ہوتا ہے اور پینے کو بیئر، کولا، سولو، سیون اپ یا فارس۔ کھانے کے بعد پھر گپ شپ کا دور چلتا ہے پھر سویٹ ڈش سرد ہوتی ہے، پھر گپ شپ، ساتھ ویڈیو پر کوئی ہندوستانی فلم دیکھی جاتی ہے۔ پھر فروٹ اور آخیر میں چائے یا کافی۔ رات کو کوئی ڈیڑھ دو بجے جا کر چھٹی ملتی ہے۔ ایسی پارٹیوں میں بھی میرا مینو حسب معمول مندرجہ بالا حدوں تک محدود رہتا ہے۔ نتیجتاً چاروں طرف سے اپنی بھوک کی کمی کی شکایتیں سُن سُن کر مجھے سچ مچ اپنی بھوک پر شک ہونے لگتا ہے۔

میں ایک عرصہ سے ڈھونڈ رہا ہوں کہ بھوک آخر رہتی کہاں ہے اور میرے نزدیک کیوں نہیں پھٹکتی۔ لوگ تو کھاتے کھاتے اپنی پتلونوں کے اوپری بٹن تک توڑ بیٹھتے ہیں مجھے کیا بیماری ہے کہ میں ایک آدھ لذیذ سالن، دو روٹیوں اور تھوڑے سے سلاد سے مطمئن ہو جاتا ہوں۔

میں چھ سال بعد اگلے مہینہ انڈیا جا رہا ہوں۔ ابھی بھی میں سنتا رہتا ہوں کہ ہندوستان بھوکا ملک ہے۔ امید ہے مجھے بھوک وہاں ضرور مل جائے گی اور وہ خود میری بھوک کو بھی چمکا دے گی۔ پندرہ سال کی خود ساختہ جلاوطنی میں، میں صرف ایک بار وطن جا سکا تھا۔ مگر گئی سال پہلے بھوک کا ایک نمونہ خود چل کر میرے پاس ناروے آگیا تھا۔ سیٹھ رن چھوڑ لال سیٹھی یورل کے سستے ٹکٹ پر اپنی بیوی کے ساتھ یورپ کی سیر پر نکلا ہوا تھا۔ ناروے دیکھنے کے لیے وہ میرے ایک دوست کے سفارشی خط کے ساتھ میرے ہاں آگیا تھا۔ وہ دہلی میں اپنی بڑی بڑی کوٹھیوں، کاروں، نوکروں چاکروں اور بزنس کی ڈینگیں مارتا تھا۔ جب وہ ادھر سے جرمنی جانے لگا تو یہاں کے ریزرویشن آفس سے ٹرین میں دو سیٹیں ریزرو کرانا چاہتا تھا۔ کلرک نے کہا تھا۔ یہاں سے تو کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔ سیٹھ کے بہت زیادہ منت سماجت کرنے پر اس نے کہا تھا۔ ڈنمارک

سے فون کر کے کوشش کرتا ہوں۔ شاید وہاں سے مل جائیں مگر آپ کو تھوڑا سا فون کا خرچہ ادا کرنا ہوگا۔ میرے ماننے پر کلرک نے کوپن ہاگن فون کر کے سیٹیں حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی مگر وہاں سے بھی اسے نفی میں جواب ملا تھا۔ "ساری سیٹیں وہاں بھی فل ہو چکی ہیں۔ آپ فون کے دس کرونے ادھر کاؤنٹر پر ادا کر دیجئے!" کلرک بولا تھا۔

میزبان کے ناطے ادائیگی کے لیے میں ہی کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا تھا مگر سیٹھی صاحب نے میری بانہہ تھام لی تھی۔

سیٹیں تو ریزرو ہو نہیں سکیں۔ ادائیگی کس بات کی۔ چلو ادھر دوسرے دروازے سے کھسک چلیں۔" سیٹھ نے کلرک کو اپنے کام میں مصروف دیکھ کر کہا تھا۔ "ہماری درخواست اور ماننے پر ہی اس نے ڈنمارک فون کیا تھا۔" میں نے کہا تھا اور اس سے بانہہ چھڑواتے ہوئے اپنی آستین کا بٹن ہی تڑوا بیٹھا تھا۔ تب میں نے سوچ لیا تھا کہ بھوک وہاں رہتی تھی مگر دہلی جا کر جب میں نے اس کا بزنس، کار، کوٹھی اور نوکر چاکر دیکھے تھے تو میں نے اپنی 'بھوک' کے معنی بدل لیے تھے۔ کیوں کہ میں نے دیکھا تھا کہ وہاں اس کے ہاں دعوت میں کھانا پینا اور عیش و عشرت ہماری یہاں ناروے کی دعوتوں سے کسی بھی طرح کم نہیں تھا مگر یہ ضرور تھا کہ وہ ایک بزنس دعوت تھی۔

مگر یہ کافی پرانی بات ہے۔ اب کئی سال بعد میں پھر بھوک کی کھوج میں اپنی بیوی کے ساتھ ایر انڈیا سے دہلی جا رہا تھا۔ ہم اوسلو سے بذریعہ لیوفتھانسہ دوپہر ایک بجے فرینکفرٹ پہنچے تھے۔ آگے دہلی کے لیے ہماری ایر انڈیا کی فلائٹ رات دس بجے روانہ ہونی تھی۔ ٹرانزٹ میں بیٹھے بیٹھے ہی اچانک ہماری نظریں بورڈ پر پڑ گئی تھیں۔ فلائٹ رات دس بجے کی بجائے ایک بجے پرواز کر رہی تھی یعنی تین گھنٹے لیٹ۔ شام آٹھ بجتے بجتے سب مسافروں کے پیٹوں میں بھوک کے چوہے اچھل کود مچانے لگے تھے۔ کچھ لوگوں نے انفارمیشن کاؤنٹر پر شکایت بھی کی تھی کہ جب ان کی فلائٹ اتنی لیٹ ہو گئی ہے تو ان کے کھانے پینے کا بندوبست یہیں پر ہی کر دیا جانا چاہیئے۔ کاؤنٹر پر جرمن اٹنڈنٹ گرل نے

ان سے کہا تھا۔ آپ ایر انڈیا کے پسنجر ہیں۔ آپ کے کھانے وغیرہ کا انتظام انھیں ہی کرنا چاہیئے آخر ایک بچے والی عورت کے بار بار جا کر پوچھنے پر اور اصرار کرنے پر تنگ آ کر اس نے شہر سے ایر انڈیا کے کسی ملازم کو بلوا لیا تھا اور وہ صرف بچے والی عورت کو گیارہ مارک کا ایک کوپن دے کر جانے ہی لگا تھا کہ میں نے اسے روک کر کہا تھا۔ "ہم بھی تو ایر انڈیا کے یاتری ہیں۔"

"آپ کو پلین میں کھانا ملے گا۔" اس نے لاپرواہی سے جواب دیا تھا۔

"پلین رات ایک بجے اڑے گا اور کھانا کہیں جا کر دو اڑھائی بجے سرو ہوگا۔" میں نے شکایت کی تھی۔

"ساری۔ میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔" وہ مڑنا ہی چاہتا تھا کہ میری بیوی نے اسے گھیر لیا تھا۔ "کیسے کچھ نہیں کر سکتے۔ جہاز ہم نے تو لیٹ نہیں کیا۔ ہم بھی تو آپ کے یاتری ہیں۔ ہمیں رات اڑھائی تین بجے تک بھوکا رکھنا کہاں تک جائز ہے۔"

"آپ چلائیے مت۔ یہ یورپ ہے' انڈیا نہیں۔" وہ بولا تھا۔

"تو انڈیا میں چلانا جائز ہے؟" میری بیوی نے اور زیادہ زور سے چلا کر کہا تھا۔ "آپ نے ہی اسے انڈیا بنا رکھا ہے۔ آئی' دل رپورٹ ٹو انتھارٹیز۔"

وہ چلا گیا تھا مگر آدھے گھنٹے بعد پھر خود ہی واپس آ کر سب مسافروں کو ریسٹورنٹ سے کھانے کے کوپن بانٹ گیا تھا۔ تب میں سوچتا رہ گیا تھا۔ بھوک کہاں تھی۔ میری بیوی کے دماغ میں' جس کا پرس کرونر' مارک اور ڈالروں سے بھرا ہوا تھا یا دنیا کی بہترین ایر کمپنیوں میں گنی جانے والی ایر انڈیا میں جو کرائے میں کھانے کے پیسے چارج کر کے بھی اپنے مسافروں کو بھوکا مارنا چاہتی تھی یا اس کے جنم جنمانتر سے بھوکے اس عملہ میں' جنھیں بھرتی کرتے وقت ان کے ذہنی دیوالیہ پن کی بھوک کو مد نظر نہیں رکھا جاتا تھا۔

دہلی میں' میں اس دن گھر کے دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ جب ایک فقیر نے گلی کے دائیں سرے سے صدا لگانی شروع کی تھی۔ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ "بابو لوگو۔ دولتاں والیو۔ بھگوان تمہارا تھان مکان قائم رکھے۔ تمہاری اولادیں پھلیں پھولیں۔ بچی کی ماں بیمار

پڑی ہے۔ بچی بھوکی ہے۔ میں لاچار ہوں۔ آپ کی مدد کا طلب گار ہوں، آپ ایک دو گے، بھگوان آپ کو لاکھ دے گا۔"

اب میری جیب میں لاکھوں تو نہیں، ہزاروں ضرور تھے مگر نہ جانے یہ میرے اندر فقیر کی دعاؤں کے طفیل لاکھوں حاصل کر لینے کی بھوک تھی یا فقیر سے سچی ہمدردی، جو مجھے فقیر کے پاس لے گئی تھی۔ میں نے پانچ کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھانا چاہا ہی تھا کہ اُدھر اس کی گود کی تین چار سالہ بچی کا ہاتھ میکانکی انداز میں نوٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ہمدردی کی ایک لہر میرے دل کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تیر گئی تھی۔ میں نے ہاتھ روک لیا تھا اور کہا تھا۔ "اندر آجاؤ۔ پہلے خود اور بچی کو کھانا کھلا لو۔ پھر کسی اچھے ڈاکٹر کو لے کر تمہارے ساتھ چلوں گا اور تمہاری بیوی کا معائنہ کروا کر علاج و معالجہ کا تمام خرچہ اٹھاؤں گا اور کچھ نقد بھی دوں گا۔"

"نہیں بابوجی۔" اس کی نظریں نوٹ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ "بیوی تو ہسپتال میں داخل ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ یہ تھوڑا سا کھانا اُدھر پہلے والے گھر سے مل گیا ہے۔ پیٹ بھر ہی جائے گا۔"

میری مدد سے اس کا انکار، اس کے جھوٹ کو ننگا کرنے لگا تھا۔ وہ بیسیوں کو ٹھکرا کر نقد پانچ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میری ماں پانچ کا نوٹ میرے ہاتھ میں دیکھ کر بولی تھی۔ "نہ وہ بھوکا ہے اور نہ ہی اسے اتنے روپوں کی ضرورت ہے۔ بس اسے ایک روپیہ دے دو۔"

"ماں۔ بھوکا تو وہ ہے اور اسے پانچ سے کچھ زیادہ ہی کی ضرورت ہے۔" میں نے نوٹ بچی کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا تھا۔ "ہاں وہ امیر لوگ، جو لاکھوں کی ڈھیری پر بیٹھ کر بھی کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں، ان سے تھوڑا کم بھوکا ہے۔"

نوٹ حاصل کرتے ہی فقیر جلدی جلدی ہماری گلی سے کھسک گیا تھا کہ کہیں میرا ارادہ نہ بدل جائے اور میں اسے پیچھے سے آواز نہ دے دوں۔ مگر دور ہمارے محلے کی پانچویں گلی سے اب بھی اس کی دردناک آواز خالی کشکول بنی لوگوں کی ہمدردیوں کی بھیک مانگ رہی تھی۔

دو دن بعد دہلی کے اپنے دوست کی بیٹی کی شادی میں میں بھی حاضر تھا۔ اس نے مجھ سے تیس ہزار روپے ادھار لیے تھے جو میں جانتا تھا کہ کبھی واپس نہیں کیے جائیں گے اور اگر کبھی میں نے ان کی واپسی کی بات کی تو مجھے اپنی دوست کی یاری سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے۔

برات کے لیے پارک میں شاندار رنگ برنگے تنبوؤں کا محل کھڑا کیا گیا تھا جس میں دبیز غالیچوں پر فوم کے ملائم صوفے تھے اور سارے میں رنگ برنگے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اس کونے سے اس کونے تک انواع و اقسام کے کھانوں کا بندوبست تھا۔ قسم قسم کا گوشت، کھوئے، پستہ اور بادام کا خالص گھی سے تر تراتا گرم گرم حلوہ۔ پھلوں کی ڈھیریاں، مشروبات جگہ جگہ چاٹ کلفی، آئس کریم، چائے یا کافی اور پان سگریٹ کے سٹال لگے تھے۔ جو جی چاہے کھاؤ، جہاں جی چاہے بیٹھو۔ ہلکی پھلکی موسیقی جس میں آرکسٹرا پر مکیش، لتا، محمد رفیع، کشور کمار، اور آشا بھوسلے کی گیتوں کی دھنیں بجتی تھیں۔ دروازے پر میرا دوست، ہاتھوں میں ڈبے اور کٹورے لیے فقیروں اور محتاجوں کی بھیڑ کو دھتکارتا ہوا بھگاتا پھرتا تھا۔

دوست کی بیٹی اپنی ہی بیٹی ہوتی ہے۔ میزبانی کا بہت سا کام میرے ذمہ بھی تھا۔ اس لیے میں ایک مہمان کا ساتھ دینے کے لیے ایک پیالی چائے اور ایک سنگترہ کے علاوہ اور کچھ نہیں کھا سکا تھا۔ رات دو بجے سب مہمانوں کے جانے کے بعد ہم نے دیکھا تھا کہ ڈھیروں کھانا بچ گیا ہے۔ میرے دوست نے کہا تھا "سو سات مہمانوں کے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا مگر آئے تھے صرف پانسو۔ یہاں لوگ آنے یا نہ آنے کی اطلاع نہیں دیتے۔" اس نے بتایا تھا۔ "اس لیے آپ جتنے دعوتی کارڈ بھیجتے ہیں ان سے کچھ زیادہ کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔"

"مگر لگتا ہے کھانا تو تقریباً آدھا باقی پڑا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ شادیوں کا موسم ہے۔ لوگوں کو ایک ہی دن میں کئی کئی شادیاں بھگتانی اور دوستیاں نبھانی ہوتی ہیں۔ کہیں سگریٹ پی، کہیں سنگترہ چھیلا اور کہیں صرف چہرہ دکھایا، ہاتھ ملایا۔ آپ کی نظر چوکی اور وہ لگے اڈے۔ جہاں انھیں اس سے کچھ بہتر کھانے، کسی بہتر تعلق یا کسی مفاد کا لالچ گھسیٹ رہا ہوتا ہے۔"

یورپ میں تو لوگ آنے یا نہ آسکنے کی فون یا خط کے ذریعے پہلے سے ہی اطلاع دیتے ہیں اس لیے آپ کا ایک بھی مہمان کم یا زیادہ نہیں ہوتا مگر یہ وہاں کے مقامی لوگوں کی بات ہے اپنے مشرق کے لوگ تو وہاں بھی کوئی اطلاع نہیں دیتے اور اچانک آدھمکتے یا غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنے کا وعدہ کر کے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے کوئی بہانہ بنا کر فون پر معذوری ظاہر کر دیتے ہیں اور میزبان کی بھری میزیں کھانے والوں کے منھ کو ترستی رہ جاتی ہیں۔ یورپ میں فقیر نہیں ہوتے اور جو ہوتے ہیں وہ کھانا نہیں پیسہ مانگتے ہیں۔ کتوں بلیوں کو بھی ڈالنے کی اجازت نہیں ہوتی اس لیے کھانا کئی کئی دن فرج میں پڑا سڑتا رہتا ہے۔

کناٹ پیلیس جس کی مہنگائیاں کبھی میرے جیسے درمیانہ طبقہ کے شخص کو اپنے کوریڈوروں سے گذرنے تک کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ اب میری فارن کرنسی سے بھری جیبوں کو بہت سستی محسوس ہوتی تھیں۔ اگر جہاز پر بیس کلو سے زیادہ وزن لے جانے کی اجازت ہوتی تو میرے جیسے بھوکے انسان سارا کناٹ پیلیس اور تمام صوبوں کے اسٹیٹ ایمپوریم کے بہترین ڈیکوریشن پیسز خرید کر اپنے یورپ کے گھروں میں الٹ دیتے۔ اس دن میرے ساتھ کناٹ پیلیس کی اس مٹھائیوں کی دکان پر محلہ والوں اور رشتہ داروں کے دس بچے بھی تھے جنھیں میں اپنی کسی اندرونی بھوک کی تسلی کے لیے ٹیکسی میں لاد کر دہلی کی سیریں کرانے نکلا ہوا تھا۔ انھیں ان کی پسندیدہ مٹھائیاں، نمکین اور چھولے وغیرہ کھلاتے ہوئے میں اپنے اندر کوئی خاص قسم کی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ تبھی دو تین ادھ ننگے یتیم بچے ہمارے پاس آکھڑے ہوئے تھے اور اپنے ننگے پیٹوں پر ہاتھ مار مار کر کہنے لگے تھے۔ ”بابوجی۔ آپ کے بچے جیتے رہیں۔ ہم بھی تین دن سے بھوکے ہیں۔“

میں نے انھیں بھی ساتھ شامل کر لیا تھا اور ان کی پسند کی چیزیں انھیں سیر ہو کر کھلوائی تھیں۔ جاتے وقت ان کے گڑگڑانے پر انھیں دو دو روپے بھی پکڑا دیئے تھے۔ کھا پی کر ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ مجھے وہاں بھول گئی اپنی کتاب یاد آگئی تھی۔ اس کی تلاش میں میں واپس پلٹا تھا تو میں نے دیکھا تھا۔ وہ تینوں اب اور لوگوں کو اپنے ننگے ننگے پیٹ دکھا دکھا کر اور ہتھیلیوں سے بجا بجا کر تین دن سے بھوکے ہونے کی فریادیں کر رہے تھے۔ کتاب اٹھا

اور ان کی نظریں بچا کر میں الٹے قدموں لوٹ آیا تھا کہ مجھے اصل بھوک کی ہلکی سی جھلک وہیں نظر آگئی تھی مگر لگتا تھا کہ ابھی کہیں کوئی کسر ہے۔

ایر انڈیا کی فلائٹ میں واپسی پر مجھے وہ سیٹ ملی تھی جو دو گوری اور جوان میموں کے ساتھ تھی اور ان کے ساتھ تھے چار بچے۔ سانولے، سلونے، کمزور اور ہر زاویے سے ہندوستانی۔ جن میں دو لڑکے چار چار سال کے، ایک لڑکی ساڑھے تین سال کی اور ایک بچی اڑھائی سال کی تھی۔ لڑکے تو کھلونوں سے لدے پھندے کھڑکیوں سے باہر اڑتے بادلوں کو دیکھنے میں مگن تھے۔ بادل، جو ان کے اپنے گاؤں میں ان سے میلوں دور اونچے آسمانوں پر پھیلے رہتے تھے۔ اب بالکل ان کے پاس آگئے تھے اور کھڑکیوں کے شیشوں کو چومتے ان کے قریب سے گذر رہے تھے بالکل ان کے اپنے ماں باپوں کی طرح، جو انھیں بیچنے کے لالچ میں گاؤں میں آئے کسی گورے صاحب یا میم کی کار کے شیشوں کو چومتے، تھپتھپاتے دور تک ساتھ دوڑتے چلے جاتے تھے۔ ننھے منھے بچے خود بھی اس کے ساتھ کاروں کے پیچھے بھاگتے اور کچھ ہی فاصلے کے بعد گر گرا کر اپنی بے ارادہ دوڑ دھوپ کو بھول کر راستے کی دھول مٹی میں کھیلنے بیٹھ جاتے تھے۔

تنگ جگہ، طویل سفر اور اجنبی چہروں میں بچے جب کھڑکی سے باہر بادلوں کو دیکھتے دیکھتے اکتا جاتے تو ان کے چہرے کچھ یادوں کی اداسیوں سے لپ جاتے اور کچھ دیر بعد انھیں میموں کے اجلے کپڑوں اور چمکتے چہروں کا حسن بھی اپنی طرف راغب نہ کر سکتا اور وہ ریں ریں شروع کر دیتے۔ اچانک تینوں بچوں نے تو اپنی باہیں ہرا ہرا کر میری گود میں آجانا چاہا تھا۔ ایک میم اشارہ سمجھ کر میرے ساتھ والی سیٹ خالی کر کے اگلی سیٹ پر چلی گئی تھی۔ اور میں نے تینوں بچوں کو اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ شاید میرے اور میم کے ذہن میں بیک وقت ایک ہی خیال کوند گیا تھا، میرے گندمی رنگ اور کالے بالوں کا۔ میموں نے اپنے جدا رنگ کی مجبوری، اپنے وقتی آرام اور بچوں کی تسکین کی خاطر انھیں میرے چارج میں سونپ دیا تھا۔

کھانے کی سروس بہت لیٹ شروع ہوئی تھی اور بچے سب کچھ بھول بھال کر

اپنے ننھے منھے ہاتھوں کو لتھیڑے خود آپ اور میموں کے ہاتھوں سے بھوکے بندروں کی طرح پپالپ اپنے پیوٹے بھرنے میں مصروف تھے۔ دوسری میم اڑھائی سالہ بچی کو خود اپنے ہاتھوں سے کھلانے میں مصروف تھی۔ وہ جب بھی ایک نوالہ اپنے منھ میں ڈالنے کے لیے لمحہ بھر کی دیری کرتی تو بچی رونے لگ جاتی۔ وہ اپنی پلیٹ کا پورا کھانا ختم کر کے اب میم کی پلیٹ پر بھی ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ میم مجھ سے یا شاید ہواؤں سے کہہ رہی تھی کہ "سمجھ نہیں آتی۔ اتنی چھوٹی بچی اتنا کھانا جانے کس کوہان میں غائب کرتی جا رہی ہے۔"

آب و ہوا

"تم تو جانتے ہو مجھے سردی شوٹ نہیں کرتی اور تم مجھے اس ٹھنڈے یخ بستہ ملک میں بھیجنا چاہتے ہو۔"

"جانتا ہوں۔ تم اب چون کراس کر رہے ہو اور بھابھی کو بھی یہ تکلیف پچھلے دس سال سے ہے۔ تب سے جب تم چالیس کے پیٹے میں تھے۔ مرد پر اصلی جوانی تو چالیس کے بعد آتی ہے اور بھی عورت کی ٹانگیں چلنے سے رہ جائیں تو پھر اس کے پاس مرد کے لیے باقی رہ ہی کیا جاتا ہے۔"

"اور اب میرے پاس بھی کیا رہ گیا ہے۔ میں تو ریٹائرمینٹ مانگ رہا ہوں اور آپ........"

"جانتا ہوں مگر تمہارے پاس ابھی تین سال اور باقی ہیں۔ ہم تمہیں اٹھاون پر ریٹائر کر دیں گے۔ وہاں جاؤ گے تو یہی تین تیرہ سال ہو جائیں گے اور خود کو جوان محسوس کرتے لگو گے۔ وہاں ریٹائرمنٹ ایج ساٹھ سال ہے۔ تمہاری عمر والے کو تو وہاں جوان ہی مانا جاتا ہے کیوں کہ اس کی ریٹائرمنٹ ابھی کئی سال دور ہوتی ہے۔" مینجنگ ڈائرکٹر نے آنکھ دبا کر کہا۔ "بڑے موج میلے ہیں وہاں۔ جاتے ہی وہاں خود کو جوان اور صحت مند محسوس کرنے لگو گے۔"

"صاحب۔ میں نہیں جا سکوں گا۔" وہ دوستی سے حاکم ماتحتی پر آتے ہوئے بولا۔

"کیسے نہیں جا سکو گے ؟" صاحب بھی پورے حاکم بن گئے۔ "تمہیں معلوم ہے ہماری کمپنی کی ہر آئٹم گھاٹے میں جارہی ہے۔ ایک یہی آئٹم ہے جو باقی سب نقصانات کو پورا کر کے نفع دیئے اور کمپنی کو چلائے جارہی ہے۔ اس نئے ملک میں نئی برانچ پر میں کسی نئے چھوکرے کو بھیج کر اپنا بیڑہ غرق کرلوں ؟ جاؤ تیاری کرو۔ اگلے مہینے تمہارا سارا سامان بُک کر دیا جائے گا۔ تمہاری رہائش کے لیے وہاں نیا اور ماڈرن فلیٹ لے لیا ہے اور وہاں تمہارے لیے ایک کتا بھی رکھ لیا ہے ساتھ لے جانے کے لیے۔ بڑا ہی شریف اور وفادار ہے۔ تمہارے گھر سے باہر قدم تک نہیں نکالے گا۔" اور ساتھ ہی صاحب نے الیکٹرک بیل بجادی۔ ایک جن نما چپراسی سر جھکائے دروازے میں آ کھڑا ہوا جیسے بیل الہ دین کا چراغ تھی جسے گھستے ہی ایک جن ہر حکم کی تعمیل کے لیے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر حاضر ہو جاتا تھا۔

"اسے اندر بھیجو۔" صاحب نے حکم دیا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے نرم لہجے میں بولے۔ "وہاں ایک گوری میم سکریٹری رکھ لینا۔ کچھ سٹاف یہاں سے بھی جائے گا۔ تم میرے صرف ملازم نہیں دوست بھی ہو۔ وہاں تنخواہ بھی بہت اچھی ملے گی۔ دوسرے میں چاہتا ہوں تم ریٹائرمنٹ سے پہلے فارن کرنسی کما کر اپنا گھر ماڈرن سازوسامان سے بھر لو۔"

دو منٹ بعد ہی ایک لڑکا ڈرتا ڈرتا، سہما سہما اندر آیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا ؟"

"م۔م۔ موتی صاحب۔" لڑکے نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

جب اپنا نام بتایا کرو تو ساتھ 'صاحب' مت لگایا کرو۔ سمجھے۔ جاؤ باہر بیٹھو۔" اس کے جانے کے بعد صاحب بولے۔ "سالہ موتی کے ساتھ 'صاحب' لگاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے مجھے 'موتی' کہہ رہا ہو۔" پھر اس سے بولے۔ "دیکھ لیا اپنے موتی کو۔ بڑا اسمارٹ ہے۔ بہت کچھ پہلے سے بھی جانتا ہے پھر بھی پچھلے چھ مہینوں سے ہر قسم کے انگریزی اور ہندوستانی کھانوں کی خاص ٹریننگ دلوا رہا ہوں۔ وہاں تمہیں کئی کئی پارٹیاں دینی ہوں گی۔ باورچی اچھا ہونا چاہیئے۔ مرسیڈیز کار تمہیں وہیں مل جائے گی۔ شرابیں وہاں بہت ملتی ہیں۔ ندیاں بہا دینا مگر

وہاں ہماری برانچ خوب کامیاب ہونا چاہیے۔"

"اس کوری آنکھوں والی بلی کے لیے یہاں رہنا چاہتے ہو۔ اس دن دروازے تک آگئی تھی تم کو پوچھتی ہوئی۔ بڑے صاحب تو کہتے تھے تم کتے کی طرح وفادار رہوگے۔" مالکن نے کہا۔

"جی میں نے پورے تین سال ایک وفادار کتے کی طرح آپ کے تلوے چاٹے ہیں۔ آپ کو یا صاحب کو کبھی شکایت کا کوئی موقعہ نہیں دیا۔ زبان تک نہیں ہلائی۔" موتی بولا۔

"تو اب تمہیں زبان لگ گئی ہے۔"

"نہیں بی بی جی۔ آپ تو واپس جارہے ہیں۔ میرے جیسے وہاں آپ کو اور بہت مل جائیں گے۔ بھگوان کے لیے میرے گلے سے پٹہ نکال کر مجھے آزاد کردیجیے۔"

"بلی اور کتے کا بیر تو مشہور ہے۔ تیری اس سے نبھے گی نہیں۔ کہے دیتی ہوں۔"

"بی بی جی۔ یہ اپنے وہاں کے محاورے ہیں۔ یہاں تو بلیاں کتے ایک ہی گھر اور ایک ہی ڈربے میں اکٹھے رہتے ہیں۔"

"اور ایک دوسرے کا منہ بھی چاٹتے ہیں۔" مالکن نے مشترکہ گیلری میں پڑوسی کے بلی کتے کو ایک ہی صوفے پر اکٹھے بیٹھے اور چہلیں کرتے کئی بار دیکھا تھا۔

مالکن کی منہ چاٹنے کی بات سے حوصلہ پاتے اور حامی بھرتے ہوئے وہ بولا، "ہم نے شادی کرلی ہے۔"

"شادی؟ کب کی شادی؟؟ مرجانیا۔ چوبیس گھنٹے تو تو گھر میں رہتا ہے۔ ایک پل بھی میں تیری زنجیر نہیں کھولتی۔ باہر تک بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ پارٹیوں میں بھی تجھے کچن سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ باہر کی سروس دفتر سے کوئی بندہ بلوا کر کروالیتی ہوں۔"

"بی بی جی۔ اس دن صاحب نے دفتر بلایا تھا۔ ۔ ۔"

"تو تو صاحب کے دفتر کی بجائے شادی کے دفتر چلا گیا تھا۔ میں تو تجھے سیدھا سادہ بندہ سمجھتی تھی۔"

"صاحب بھی ساتھ تھے۔ انہی نے تو سب بندوبست کیا تھا۔"

"ہائے میں مرجاؤں۔" مالکن نے ماتھا پیٹ کر کہا۔ "یہ تیلی اپنے ہی گھر سے لگی ہے نہیں تو جھوٹ بکتا ہے حرام خور۔"

"نہیں بی بی جی۔ صاحب کہتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ میرا بھی کام۔ ۔ ۔ ۔"

"بکواس مت کر۔ صاحب کا نام لیتا ہے۔ وہ تو۔ ۔ ۔ ۔ ہوا تو تمہیں لگ گئی ہے یہاں کی۔"

"نہیں جی۔ ہوا کیا لگنی ہے۔ میں تو خادم ہوں آپ کا۔"

"تو پانی لگا ہوگا۔"

"وہ تو بی بی جی۔ بڑے لوگوں کو لگتے ہیں۔ ہم غریبوں کو اور کیا لگنا ہے۔ ہمیں تو غریبی کی بیماری لگتی ہے اور ہم زندگی بھر اسی کا علاج کرتے رہتے ہیں۔ آپ تین سال تک مجھے اپنے ملک کے چند سکے ماہوار تنخواہ دیتی رہی ہیں۔ گھر سے باہر قدم تک نہیں رکھنے دیا۔ چوبیس گھنٹے تک کھڑکیاں بند رکھی ہیں۔ مجھے ہوا کہاں سے لگنی ہے۔"

"وہ تو میری ٹانگیں سردی سے جم جاتی ہیں اس لیے کھڑکیاں بند رکھنی پڑتی ہیں۔"

"بی بی جی۔ میں شکایت نہیں کر رہا۔ آپ تو جا رہے ہیں۔ مجھے یہاں چھوڑ جائیں میرا اور میرے سارے خاندان کا علاج ہو جائے گا۔"

"خاندان کو کیا ہوا ہے؟" مالکن کو بھول جانے کی بھی بیماری تھی۔

"بی بی جی۔ غریبی۔ آپ کی مہربانی ہوگی تو ہمارے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"وہ تو میں دیکھوں گی تجھے چھوڑنا ہے کہ رکھنا ہے۔ پہلے یہ بتا۔ اس بلی سے ملاقات کب ہوئی، کہاں ہوئی۔ گھر سے تو تو قدم بھی باہر نہیں نکالتا۔"

"بی بی جی۔ گرمیوں میں میں آپ کو تھام کر باہر گھمانے لے جاتا تھا وہ بھی اپنی بوڑھی ماں کو گھمانے لاتی تھی۔"

"تو وہیں سے آنکھ مٹکا ہو گیا؟"

"نہیں بی بی جی۔ جب آپ ایک بار گر گئی تھیں تو آپ مجھ اکیلے سے اٹھائی نہیں جا رہی تھیں۔"

"پھول جیسی تو میں ہلکی پھلکی ہوں۔"

"جی بی بی جی" اس نے ہتھنی جیسی مالکن کو چاروں زاویے سے دیکھتے ہوئے ہونٹوں پر تھرکتی ہنسی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دراصل آپ گری ایسی جگہ پر تھیں کہ ..... اور آپ کا پیر بھی الٹا پڑ گیا تھا نا۔ تو آپ کو دو طرف سے اٹھانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔"

"مجھے تو کچھ یاد نہیں۔"

"بی بی جی۔ وہ بھی وہاں پارک میں ماں کو گھماتی پھرتی تھی۔ تب وہی میری مدد کو دوڑی آئی تھی اور آپ کو اٹھاتے ہوئے ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر آ گئے تھے۔"

"اچھا تو پھر ہاتھوں کی بات دماغوں پر چڑھ گئی۔"

"نہیں بی بی جی۔ روز تو ملتے تھے۔"

"ہائے میں مر گئی۔ کہاں ملتے تھے تم لوگ روز؟"

"جب میں آپ کو گھمانے لے جاتا تھا تو وہ بھی ماں کو لے کر آتی تھی۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے روز ملتے تھے۔ ملتے کہاں تھے؟"

"وہیں پارک میں۔"

"تو آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوں گی۔ میں تو تجھے بھولا بھالا بے زبان اور نادان کتورا سمجھتی تھی تو تو بڑا گھاگ نکلا۔"

"نہیں بی بی جی۔ وہ بڑے صاحب ....."

"کیا کیا بڑے صاحب نے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ کہتے تھے شادی کر لو۔ پھر ....."

"پھر کیا؟"

"وہ مانی ہی نہیں۔"

"تم تو کہہ رہے تھے شادی کر لی ہے۔"

"ہاں بی بی جی۔ صاحب کی دوسری بات کے لیے نہیں مانی وہ۔ دراصل ....."

"کمینے۔ تیرے صاحب تو بالکل موم ہیں۔ میں نے موم بتی بنا کر ان سے اپنا گھر روشن کر لیا

توانھوں نے کھڑکی کے پردوں تک سے اپنی روشنی باہر نہیں جانے دی۔ اور تو...... میرے جیسی گلبدن پری انھیں اور ملتی بھی کہاں۔ جان چھڑکتے ہیں مجھ پر اور تو...... لانا تو ذرا میری چھڑی۔"

"کیوں باہر جانے کا ارادہ ہے۔ بی بی جی آج ٹھنڈ بہت ہے۔"
"نہیں تیری پٹائی کرنی ہے، تیری ملاقات کرانے باہر کیوں جاؤں گی۔"
"تو پھر خود ہی اٹھالو۔" اسے پتہ تھا بی بی جی۔ چار من کی لاش گھسیٹ کر چھڑی تک نہیں پہنچ سکتیں۔

ملاقات! اسے دن بھر کی قید اور رات کی آزادیاں یاد آنے لگیں جب وہ رات صاحب اور مالکن کو دودھ کے گلاسوں میں باداموں کا چورا اور چینی ملا کر پلا کر اپنے کمرے میں آتا تو سامنے گلی کے چوتھے مکان کی کھڑکی سے ٹارچ کا ہرا شیشہ اپنی ہری روشنی سے سگنل دیتا اسے اپنے پاس بلاتا نظر آتا۔ اور ایک ریلوے ڈرائیور کی طرح ہری اور لال بتیوں کی تابع داری میں وہ اپنے سرونٹ روم کی کھڑکی سے لٹکتی رسّی کو بنا زہریلے ناگ یا رسّی جانے اوپر اس کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ ایک بار مالکن نے شکایت کی تھی کہ وہ دودھ پینے کے بعد کسی کام سے اسے بلاتی رہ گئی تھیں مگر وہ نہیں آیا تھا۔ تب وہ بہت گھبرایا تھا۔ اگر بھید کھل جاتا تو مالکن فوراً ٹکٹ کٹا کر اسے واپس ملک بھجوا دیتیں۔ اور ابھی تو ادھر اس کے قدم بھی پکے نہیں جمے تھے۔ وہ کوئی بہانہ بنانے کے بارے سوچ ہی رہا تھا کہ مالکن نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

"کوئی گولی کھا کر سوتا ہے رے تو؟"
"جی بی بی جی۔ سونے سے پہلے ڈسپرل کی تین گولیاں کھاتا ہوں، تھک جاتا ہوں نا دن بھر کے کام سے۔"

پھر تین دن اسے ہری بتی بلاتی رہی تھی مگر وہ ادھر سے بے پرواہی کی لال بتی ہی دیے جاتا رہا۔ پارک کی سیر پر اشاروں اشاروں میں اس نے اسے بتایا کہ مالکن اس کی چٹنی بنا دیں گی اگر انھیں پتہ چل گیا کہ وہ رات کو غائب رہتا ہے اور اس نے گولیوں والا بہانہ بھی

اسے بتا دیا تھا۔ گولیوں کی بات سُن کر اور یہ جان کر کہ اس کی مالکن اور صاحب کو رات کو سونے سے پہلے دودھ پینے کی عادت ہے۔ اس کی محبوبہ نے اسے ایسی بے ضرر قسم کی گولیاں مہیا کرنی شروع کر دی تھیں جو صرف صاحب اور مالکن کو پانچ چھ گھنٹے کی گہری نیند سلا دیتی تھیں۔ سگنل پھر ہرے ہونے لگے تھے۔ گاڑیاں پھر آنے جانے لگی تھیں۔

میں ریٹائر ہو رہا ہوں مگر میں نے آپ کو چارج دینے سے پہلے اپنی تمام آسامیوں سے ملا دیا ہے۔ کمپنی بڑی کامیابی سے چل رہی ہے۔ آپ کو ترد کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز بڑی باقاعدگی اور سسٹم سے چلتی جائے گی۔ بس آپ کو ذرا اسٹاف پر نظر رکھنی ہو گی۔ یہاں کا ماحول بڑا گمراہ کن ہے۔ میرا مطلب ہے اپنی طرف راغب کرنے والا ہے۔ دونوں مالی اور جسمانی طور پر بھی۔ میں نے کمپنی کو سٹاف کی سہولتوں اور تنخواہوں کے سٹینڈرڈ کو اونچا رکھنے کا بھی مشورہ دے دیا ہے کیوں کہ جو بھی باہر کے ملکوں کی اور کمپنیاں یہاں چل رہی ہیں وہ اپنے ملازموں کو مقامی دفاتر کے لوگوں سے کچھ زیادہ ہی تنخواہیں اور سہولتیں دیتی ہیں۔ یہ ایک قسم کا علاج بھی ہے اور لالچ بھی۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی ——— ایک ڈرامہ خود میرے گھر پر بھی کھیلا گیا ہے۔ جس میں بندوق میرے کندھے پر رکھ کر چلائی گئی تھی۔

ننھے فرشتے

پچھلے ہفتہ بدھ کے دن آسٹریلیا سے میری بیٹی کا فون آیا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے ملغوبے میں مجھے بتایا تھا کہ میرے چھوٹے بہنوئی چوہدری صاحب روڈ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہو کر ہسپتال پڑے تھے۔ اس کے ٹیلی فون کے دو گھنٹے بعد دہلی سے میرے بھانجے راکیش کا مختصر سا ٹیلی گرام آگیا تھا۔ ڈیڈی ایکسیڈنٹ ایکسپائرڈ۔

پردیس میں جب کسی نزدیکی دوست یا رشتہ دار کی ایسی المناک خبر آتی ہے تو مجھ جیسا حساس انسان ان کے ساتھ آدھا مر جاتا ہے مگر وقت کے ساتھ اس کا آدھا زندہ حصہ اس کے مردہ حصہ کو آہستہ آہستہ پھر زندگی عطا کرنے لگتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کسی درخت کا ٹہنا ٹوٹ کر ذرا بھی اپنے تنے سے جڑا رہ جائے تو پھر جی اٹھتا ہے مگر اس سارے عمل کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ بظاہر جو ٹہنا دوبارہ زندہ نظر آنے لگتا ہے غور سے دیکھنے پر اس میں پہلے جیسی بھرپور زندگی نظر نہیں آتی بلکہ اس میں ایک جھول سا صاف جھلک مارتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسا ہی ایک جھول نو سال پہلے مجھے اپنے وجود میں بھی محسوس ہوا تھا۔ جب میں اپنی آدھی موت دس سال پہلے اپنی ماں کی موت کے ساتھ مرا تھا۔ وقت کے پیوندے نے بظاہر مجھے پھر زندگی کے تنے سے جوڑ دیا تھا مگر دنیا کو نظر نہ آنے والا وہ جھول مجھے اب بھی اپنے اندر محسوس ہوتا ہے۔

اپنی اس دوسری آدھی موت پر، دفتر سے چھٹی لے کر میں پورا ہفتہ بستر پر دراز رہا تھا۔ تنگ آکر اور بیوی کے بار بار کہنے پر آج میں باہر نکل پڑا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر مجھے دفتر کی طرف دھکیل دیا تھا جو میرے ہزاروں دوستوں کا ملن بند و بھی تھا، اسے پتہ تھا کہ میں کتابوں کی دوستی میں ہمیشہ دلی سکون حاصل کر لیتا تھا اور میرا دفتر، جو لائبریری ہونے کی وجہ سے ہزاروں کتابوں کی آماجگاہ تھا، مجھے گھنٹوں اپنی سنگت میں مصروف اور غم فراموش کر لیتا تھا۔

مجھ سے چوتھے ہی اسٹاپ پر بس سکول کے بچوں سے کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ اب تک اپنی سیٹ پر میں اکیلا بیٹھا رہا تھا۔ نارویجین لوگ بس میں آکر کھڑے ہو جاتے رہے تھے۔ انھوں نے میرے ساتھ چار سیٹیں خالی ہونے کے باوجود بیٹھنا پسند نہیں کیا تھا۔ شاید شرقی کا میرا گندمی رنگ ان کے میرے نزدیک آنے میں مانع تھا مگر اب وہ چار سیٹیں لڑکوں اور لڑکیوں سے بھر گئی تھیں اور وہ شرماتے، جھجکتے میرے پاس بیٹھتے گئے تھے۔ پھر میرے کھلے رویہ اور خوش آمدید کہتے چہرے سے آہستہ آہستہ وہ مجھ سے مانوس ہونے لگے تھے۔ شاید میرا گندمی رنگ ہی انھیں پسند آگیا تھا۔ اپنے مختصر ترین بس سفر میں، اگر ساری نہیں تو آدھی وہ ضرور میرے چہرے کی کتاب پڑھ ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کے دلوں میں میرے اور میرے ملک کے بارے بے شمار سوالات کلبلانے لگے تھے اور میں دلی خوشی کے ساتھ ان کے سوالوں کے جوابات دینے کو، خود کو تیار کر رہا تھا جیسے بطور ادیب کسی بہت بڑے ادبی رسالے کے مدیر کو انٹرویو دینے جا رہا ہوں۔

انھیں حوصلہ دلانے کو پہل میں نے ہی کر دی تھی۔ میں نے ان کے ہی شہر میں سٹرلا کر، سلادرے ہانگ، سکیل سیلو ہا بانک۔ فورہان گور یوفٹ بال کا میپ، لگایا تھا۔ پھر میں نے ان سب سے ان کے نام پوچھے تھے اور غلط تلفظ ادا کر کے انھیں ہنسایا تھا۔ ان کے کئی رنگوں کے بھورے بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر اور ماں باپ اور بچوں کے دو تین لطیفے سُنا سُنا انھیں ہنسایا اور دوست بنا لیا تھا۔ ان کی ہنسی کے فواروں میں اِدھر اُدھر بیٹھے دوسرے بچے بھی اٹھ کر ہمارے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے مکئی کے بھٹوں

جیسے سُرخ و سفید اور ملائم تھے ۔ اور بال بھی بھٹوں کے بالوں جیسے لال بھورے، سنہری بھورے اور پیلے بھورے تھے ۔ ایک دو کے تو گھٹاؤں جیسی ہلکی ہلکی سیاہی بھی لئے ہوئے تھے۔ ایک نے پولی تھین کی شفاف تھیلی میں بھری قسم قسم کی رنگارنگ ٹافیوں کو سب میں بانٹتے ہوتے مجھے بھی حصہ دار بنا لیا تھا۔ دراصل اس نے اپنی ٹافیاں بانٹی ہی مجھ سے دوستی لگانے کے لیے تھیں ۔ میں نے سب سے باری باری ان کی کلاسوں کے بارے میں پوچھا تھا اور پوچھا تھا کہ وہ کون سے سکول سے آرہے تھے۔ دور کھڑی ان کی ٹیچر کو میری ان کی قربت ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی ۔ اس کی چڑھی ہوئی ناک اس کی دلی نفرت کی غماز تھی جیسے اسے ڈر تھا کہ میرے ساتھ بیٹھ کر بچے کوئی بیماری نہ لگا بیٹھیں مگر بچے اس کی گھورتی آنکھوں سے لاپرواہ میرے ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف تھے ۔ بچوں کو بڑوں کا ڈراؤنا رعب کبھی پسند نہیں آتا اور وہ جب بھی کسی مجھ جیسے بے تکلف بزرگ کی قربت میں ان ڈراؤنے پہروں سے فرار حاصل کر لیتے ہیں جو انھیں چند لمحے ہی ایسی آزاد فضائیں مہیا کر سکے تو وہ اس کے دوست بن جاتے ہیں ۔ شاید میرے چند منٹوں کے ساتھ میں انھوں نے ایک ایسا ہی بزرگ دوست پا لیا تھا۔ میرے سوالات کا خزانہ ختم ہو چکا تھا اور اب ان کی باری تھی ۔ ایک نے پوچھا، "آپ کا رنگ براؤن کیوں ہے ؟"

"کیوں کہ میں انڈیا سے ہوں ۔"

"مگر آپ کے بال تو ہماری طرح بھورے ہیں ۔" دوسرا بولا ۔

"نہیں میرے بال سفید ہیں ۔ میں نے انھیں مہندی کے ہلکے سے لیپ سے بھورا کر لیا ہے ۔"

"مہندی ! یہ کیا ہوتی ہے ؟"

"حنا ۔" میں نے جواب دیا ۔ یہی جواب میں بالغ نارویجنوں کو دیتا ہوں تو وہ سمجھ جاتے ہیں کیوں کہ انھوں نے یہ نام سُنا ہوا ہوتا ہے، مگر بچوں کے معاملے میں مجھے محسوس ہوا کہ میرا یہ جواب یہاں پر نامکمل ہے ۔ میں نے ان سے پوچھا "تم جانتے ہو، حنا کیا ہوتی

ہے ؟"

سب جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے تو میں نے کہا۔" یہ ایک طرح کی جھاڑی ہوتی ہے جس کے پتے پیس کر ایک پوڈر کی شکل میں انڈیا سے پیکٹوں میں یہاں درآمد کیے جاتے ہیں۔ میں وہی پوڈر پانی میں گھول کر تین چار منٹ لگا لیتا ہوں تو میرے سفید بال سنہری ہو جاتے ہیں۔"

ایک نے جھجکتے ہوئے کہا۔" کیا میں آپ کو ٹچ کر سکتا ہوں ؟ مجھے آپ کا براؤن کلر بہت پسند ہے۔"

" بے شک مگر۔۔۔۔"

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔" میری ممی خود کو براؤن کرنے کو گھنٹوں دھوپ میں پڑی سوکھتی رہتی ہے۔ مگر اس پر آپ کے جیسا رنگ نہیں آتا۔ وہ براؤن کرنے والی کریمیں لگاتی ہے تو بس کچھ ہی دیر کیلئے اس کا رنگ بدل جاتا ہے جو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر وہ کریم کے اتر جانے کے ڈر سے مجھے نزدیک نہیں پھٹکنے دیتی۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے میری بنا بازو کی قمیص کی ننگی بانہہ پر اپنا ہاتھ دھر دیا۔ ناوجیین بچے لائن کانشس بہت ہوتے ہیں۔ وہ باری باری میری بانہہ پر ہاتھ رکھتے اور دوسرے کو موقعہ دیتے پیچھے ہٹتے گئے۔

ان کی ہل چل اور بستے اٹھا اٹھا کر کندھے پر رکھ لینے سے لگا جیسے ان کا سٹاپ قریب آرہا تھا۔ انھیں اچانک یاد آیا جیسے وہ کوئی خاص بات پوچھنی بھول گئے ہیں۔ ایک نے رک کر پوچھا۔" آپ کا نام کیا ہے ؟"

" ہندوستانی نام ہے۔ ذرا مشکل سا ہے۔" میں نے کہا اور اپنے بریف کیس پر لکھا اپنا نام ان کے آگے کر دیا۔" کاولاہرکرن۔" ایک نے پڑھا۔

" میں نے کہا تھا نا کہ مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے کاغذ پر charles لکھا اور ایک سے کہا۔" اسے پڑھو۔" وہ بولا۔" چارلس۔"

" بس میرا نام بھی اسی طرح 'کاولاہرکرن' نہیں۔ چاولہ ہرچرن ہے۔" میں نے انھیں

سمجھایا۔ "مگر تم مجھے صرف چاولہ کہہ سکتے ہو۔"

ان کا سٹاپ، بگ ڈوئے لے، آگیا تھا۔ وہ دانہ دانہ نیچے اتر گئے۔ نیچے ان کی ٹیچر انہیں اکٹھا کر رہی تھی اور وہ بس کے ایک منٹ رکنے کے وقفہ میں اس کے سب احکام نظر انداز کر کے، مجھ شیشے کے قریب بیٹھے اپنے دوست کو اپنے بیسیوں ہاتھ لہرا لہرا کر الوداع کہہ رہے تھے۔ دو چار نے تو میرے لئے اپنے ہاتھوں کو چوم چوم کر لہرانا شروع کر دیا تھا۔ میں بس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ بس چلی تو مڑ کر میں نے شیشے میں سے پیچھے دیکھنا شروع کر دیا۔ بس کے ان کی نظروں سے اوجھل ہو جانے تک وہ اپنے ننھے منھے پُر خلوص ہاتھوں سے مجھے اپنی نیک خواہشات پیش کرتے رہے۔ چند ہی منٹوں کے ساتھ سے ننھے فرشتوں کے خلوص نے میرا سب غم چوس لیا تھا۔

اس بات کو بمشکل چار ہی روز گذرے ہوں گے کہ ایک دن صبح کے ساڑھے دس بجے میرے گھر کی کال بیل زور زور سے بجنے لگی۔ میں نے دروازہ کھولا تو باہر تقریباً دس پندرہ لڑکے لڑکیوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ ایک نے آگے بڑھ کر اور جھک کر مجھے وش کیا اور پوچھا۔ "مسٹر چاولہ۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔"

"بالکل ٹھیک۔" میں مسکرایا۔ "آپ کے سامنے تو کھڑا ہوں۔ کیوں کیا بات ہے؟"

ایک اور بولا۔ "وہ دراصل اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس لئے ہم۔۔۔۔"

"میرا ایکسیڈنٹ؟"

دوسرا ایک اس کی مدد کو آتے ہوئے بولا۔ "ہم آپ کا نام بھول گئے تھے۔ بہت مشکل ہے نا۔" اس نے ایک لڑکے کو آگے کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے آپ کے نام کے ساتھ رائٹر کا لفظ بھی پڑھ لیا تھا اور ہمیں یہ بھی یاد تھا۔۔۔۔"

"پہلے تم لوگ اندر تو آ جاؤ یا باہر ہی کھڑے کھڑے ساری کہانی سنا ڈالو گے۔" یہ کہہ کر میں دروازے سے ہٹ گیا۔

سب اندر آ گئے۔ لڑکا بولا۔ "ہم ایک انڈین کہانی کار کا گھر بھی دیکھنا چاہتے تھے۔"

میں انھیں سٹڈی میں لے آیا جسے سٹڈی روم سے ورکشاپ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ میرے کام کے سب اوزار چاروں کونوں میں اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے ہر طرف میرا کوئی نہ کوئی پروجیکٹ چل رہا ہو۔ اور یہ سچ بھی تھا۔ میں چھ سات کتابوں پر کام کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ خطوں کے جوابات اور تخلیقی کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ تھا تو یہ سب گھاٹے کا سودا، مگر اس سے دلی سکون بہت حاصل ہوتا تھا۔ وہ میری لدی پھندی رائٹنگ ٹیبل ہر قسم کے موضوعات پر کتابوں سے بھرے شیلف، فائیلوں کی ترتیب منھ میں سگار دبائے کتاب میں ڈوبے بڈھے پر دنیسر یا فلاسفر کے بت وغیرہ کو دیکھتے رہے۔ ماٹوز کو پڑھتے رہے۔ مختلف ادیبوں کے ساتھ میری تصویروں کو ملاحظہ کرتے رہے۔ ابسن کے ساتھ میری تصویر کو دیکھ کر تو وہ چونک اٹھے۔ تصویر میں ابسن کو میں اپنی ایک کتاب دکھا رہا تھا۔ میں نے مذاقاً انھیں بتایا۔ "پچھلے جنم میں میں ابسن کا ہم عصر تھا۔"

حیرانی ابھی تک ان کے بھولے بھالے معصوم چہروں پر لکھی پڑی تھی۔ اب میں نے انھیں زیادہ دیر ورطۂ حیرت میں ڈالے رکھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا۔ "سنہ ۱۹۷۸ء میں ناروے کا ایک مشہور سٹیج آرٹسٹ Rolf Sand ابسن کی ڈیڑھ سو سالہ جشن سالگرہ کے موقعہ پر ابسن کا روپ بھرتا، ہفتہ کے پورے پانچ دن اوسلو میں ابسن کے گھر واقع اربنیر گاتے (Arbins Gate) سے نکلتا، کنگ پیلیس اور کارل یوہان گاتے سے گذرتا، راستے میں یونیورسٹی کی گھڑی سے اپنی جیبی گھڑی کا بارہ بجے کا وقت ملاتا، گرینڈ ہوٹل میں اپنی دھیرک ابسن کی مخصوص کرسی پر آبیٹھتا تھا۔ اسے دیکھنے کو کارل یوہان گاتے پر ہزاروں لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا۔ وہیں جب میں نے اسے بتایا کہ میں ہندوستانی ادیب ہوں تو اس نے میرے ساتھ خاص طور پر پانچ چھ تصویریں کھچوائی تھیں۔ یہ ان ہی میں سے ایک ہے۔ مگر وہ تم میرا ایکسیڈنٹ ؟ کیا کہہ رہے تھے تم۔" میں نے اسی لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ دراصل CH سے شروع ہونے والے نام کے کسی انڈین کے ایکسیڈنٹ کی خبر سنی تھی تو ہم ڈر گئے۔ سوچا کہیں آپ۔۔۔۔"

مجھے صحیح سلامت اپنے سامنے کھڑے اور ان سے باتیں کرتے دیکھ کر وہ بولا...

"MAY GOD"

"مگر میرا ایڈریس تم نے کہاں سے حاصل کیا؟" میں نے سوال کیا۔
"نارویجین رائٹرس یونین کے دفتر اور ٹیلی فون ڈائرکٹری سے۔" وہ بولا۔
"ٹھہرو میں تمہارے پینے کے لئے کچھ لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"نہیں رہنے دیجئے۔ ہمیں پیاس نہیں۔" وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ "ہم سکول سے آدھے گھنٹے کے تفریح کے وقفہ میں یہاں آ گئے تھے۔ قریب ہی تو ہے۔"

میں پچھلے دس دن سے اپنے من اور مرنے والے کی آتما کی شانتی کے لیے گیتا پڑھ رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد چند منٹوں کے لیے پھر میں نے گیتا اٹھا لی۔ "آتما مرتی نہیں صرف چولا بدلتی ہے۔"

نیک و بد

(مختصر ترین ناول)

فلیپ

کچھ انسانوں کا ذہن شاطرانہ خیالوں کے ٹیڑھے میڑھے، کانٹے دار تاروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جب کوئی ان ٹیڑھے میڑھے تاروں میں کسی کو الجھا لیتا ہے تو ان کے سوچ بچار کی رَو چاہے سیدھی نہ ہو، مگر ان کو اپنی زندگی کے راستے ضرور سیدھے ہو جاتے ہیں۔ ایسے انسان کیسے دوسرے کو اپنے اس مکڑی جال، یا جلیبی جیسے شکنجے میں پھنساتے ہیں، یہ جاننے کے لیے میرے پیچھے چلے آئیے۔ مگر آکاش کی سیدھی اونچائیوں کی سیدھی اڑان تک پہنچنے کے لیے آپ کو میرے ساتھ قطب مینار کی سی ٹیڑھی میڑھی چکردار سیڑھیاں چڑھنا پڑیں گی۔

پیش لفظ

ولایت کا نام تو آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ میں کہتا ہوں اور آپ کے بھلے کے لیے سچ کہتا ہوں کہ وہاں پونڈ اور ڈالر درختوں پر لگے رہتے ہیں۔ صرف ہاتھ بڑھا کر توڑنے کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، بلکہ بعض اوقات وہ بھی نہیں۔ کبھی کبھی وہ تکلیف بھی آپ کے لیے کوئی اور اٹھا لیتا ہے۔ اگر کوئی آپ سے یہ کہے ایسا ہرگز نہیں

ہے، بلکہ وہاں تو دولت کمانے کے لیے بہت سخت محنت کرنا پڑتی ہے تو اس کی بکواس پر بالکل کان نہ دھریں۔ ایسا شخص اس فلم ایکٹر کی طرح ہے جو خود زیر دست ہیرو بن جاتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے انگور کھاتے ہوئے باقی دنیا کو مفت درس دیتا رہتا ہے کہ اس باغ کے سب انگور کھٹے ہیں!

دیباچہ

اگر آپ کو کھلے آکاش کی کھلی ہواؤں میں اڑنے کا شوق چرایا ہے اور ٹانگیں قطب مینار کے تھوڑے سے ٹیڑھے راستوں کا دکھ برداشت کرنے کو تیار ہیں تو بلندی جلد ہی آپ کے قدم چومے گی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی خوش قسمتی سے آپ کا کوئی شریف دوست سواری کے لیے آپ کو اپنا کندھا بھی پیش کر دے اور آپ کو اس زحمت سے بھی چھٹکارا مل جائے۔ بس تھوڑے سے تعریفی الفاظ آپ کو آنے چاہئیں اور ان لفظوں سے خلوص اور محبت کی اداکاری کا ہنر۔ اس ہنر کو آپ گاہے بگاہے اس شخص کے نام اپنے خطوں میں برت سکتے ہیں جس کے کندھوں پر آپ نے سواری کرنے کا پروگرام بنایا ہو۔ مگر اس کے لیے آپ کو اس کے ساتھ بے انتہا بے تکلف ہونا پڑے گا یا بے تکلفی پوز کرنی پڑے گی۔ تاہم یہ بے تکلفی بعد میں آپ کے بہت کام آئے گی۔ آپ چاہیں تو اس سے کوئی رشتہ بھی گانٹھ سکتے ہیں۔ اصل مقصد اسے یہ یقین دلانا ہے کہ آپ اس کے مخلص ترین دوست اور خیر خواہ ہیں۔ اس اداکاری میں آپ کامیاب ہو گئے تو سمجھ لیجیے بازی آپ کے ہاتھ ہے۔

کہانی

وہ ایک عرصہ بعد خارن سے اپنے وطن آیا تھا، کیونکہ وہ اداس بہت تھا اور قلمی دوست دقلمی آم نہیں!، نے خطوں سے ہی اس کی اداسی تاڑ لی تھی اور جان گیا تھا کہ وار کرنے کی کمزور جگہ وہی تھی؛ دوست کی اُداسی۔

قلمی دوست دکہیں سے کار مانگ کر، اسے ایرپورٹ پر لینے گیا تھا قلمی اسے اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا، مگر وہ اپنی جھونپڑی دیکھنا چاہتا تھا جس میں اس کی ماں نے اس کی جدائی میں آخری سانسیں لی تھیں۔ مجبوراً قلمی دوست اسے وہیں لے گیا تھا۔ مگر پھر جلد ہی اسے بہلا پھسلا کر اپنے گھر لے آیا تھا!

"تم اب خارن میں رہتے ہو۔ وہ گھر تمہارے لائق نہیں۔ دوسرے وہاں تم بہت زیادہ اداس رہو گے اور میں تمہارا دکھ برداشت نہیں کرتا۔" دوست نے کہا تھا۔

وہ خود بھی ماں کی یادوں سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ یا شاید یہ دوست کی محبت کی کشش تھی کہ وہ اس کے ساتھ اس کے گھر آگیا۔ دوست نے آفس سے چھٹی لے لی — وہ پندرہ دن رہا تو دوست پندرہ دن اس کے ساتھ، اس کی خدمت میں حاضر رہا۔ دوست نے میٹھے میٹھے شکنجے دخاردار تاروں کے، اس کے ارد گرد لپیٹنے شروع کیے، مگر ایک عقل مندی دچاہیں تو اسے چالبازی کہہ لیں، یہ کی کہ ان خاردار تاروں پر ملائم ربڑ چڑھا دیا جیسا بجلی کے تاروں پر کرنٹ سے بچاؤ کے لیے چڑھا رہتا ہے، تاکہ یار شروع میں ہی بدک نہ جائے۔ کرنٹ تو موقع پاتے ہی تار کو ننگا کر کے لگا دیا جائے گا۔ بجلی کے تاروں کے اوپر ربڑ کی ایک تہہ ہوتی ہے اور اس پر رنگے برنگے خوب صورت دھاگوں کی پوشش۔ دوست نے بھی یہی کیا۔ خاردار تاروں کو اس نے خوبصورت غلاف سے ڈھک دیا۔ جس کے اندر بہت نیچے کانٹے بھی تھے اور کرنٹ بھی۔

دوست کے گھر میں مہمان کی یہ پہلی رات تھی اور دوست شاید گربہ کشتن روزِ اوّل، میں یقین رکھتا تھا۔ بیڈ روم میں ایک ڈبل بیڈ تھا، جس پر وہ اور اس کی بیوی سوتے تھے۔ اس نے مہمان کو اندر لے جاتے ہوئے کہا "آپ خارن میں آرام دہ کمروں اور ملائم بستروں پر استراحت فرماتے رہے ہیں۔ یہاں سارے گھر میں یہی کمرہ اور یہی بیڈ آرام دہ ہے۔ اس لیے آپ یہیں سوئیں گے اور میں ڈرائنگ روم میں صوفے پر سو جاؤں گا۔"

ڈبل بیڈ پر دوست کی کرنٹ لگی، خاردار بیوی، جس پر نہ صرف گوری جلد کا ملائم ربڑ چڑھا ہوا تھا، بلکہ خوبصورت، رنگ برنگے تانے بانے کی نائیٹی کا جال بھی تھا جس سے

اس کا گورا گورا بدن ہزاروں کھڑکیوں سے جھانکتا اور دعوت گناہ دیتا تھا، ایک ادائے دل بری سے ایک ٹانگ بیڈ سے نیچے لٹکائے، ادھ لیٹی سی بیٹھی تھی اور اس کی آنکھیں، جو محبت کی زبان کا ہر بول جانتی تھیں، مسلسل سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

مہمان نے دوست کی یہ میزبانی قبول نہیں کی۔ اس نے کہا "صوفے پر میں سوؤں گا کیوں کہ وہاں پر میں صوفے پر ہی سوتا تھا۔" یہ سن کر بھی دوست گھبرایا نہیں۔ اس کے پاس دوست کے دل میں گھر کرنے کے اور بھی بہت سے حربے تھے، وہ اس کے سارے کام کرا دیتا۔ اپنے ملک میں جگہ جگہ میں ہر کام میں رکاوٹ ڈالنے والے جنوں بھوتوں سے پالا پڑتا ہے اور دوست کو الف لیلوی ہیرو کی طرح ان جنوں بھوتوں کو رام کرنا آتا تھا۔ وہ سب چاندی کے سکوں کے ماڈرن، گول گول سدرشن چکروں سے جلدی کٹ کٹ کر راہوں میں بچھ بچھ جاتے تھے۔ مہمان کے بہت سے دفتری کام (مثلاً اس کی پہلی نوکری سے چھٹکارا، پنشن، مکان بیچنے کی اجازت بینک اکاؤنٹ اور دوسرے تمام کام جو ایک عرصے سے رُکے پڑے تھے، اس کا دوست نہ صرف اپنی جادوئی چھڑی سے کروا لیتا تھا، بلکہ شام کو اس کے تھکے ہوئے ذہن کو تازگی بخشنے کے لیے شراب اور حسن کی محفلوں میں بھی لے جاتا تھا۔ پیسہ تو مہمان کا ہی خرچ ہوتا تھا، مگر دوست اپنی سوجھ بوجھ سے اس کا آدھا خرچ وہاں بھی بچا لیتا تھا۔

مہمان واپس ولایت جانے لگا تو دوست نے کہا "سنا ہے وہاں پونڈ اور ڈالر درختوں پر لگے رہتے ہیں۔ کیا تمہاری عنایت سے میں بھی دو ہاتھ مار سکتا ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ درخت اونچے ہیں اور ان سے پھل توڑنے کے لیے آج کل کسی کے کندھے پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔"

مہمان نے سوچا کہ سیوا رام نے بہت سیوا کی ہے۔ بدلے میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔

چنانچہ اس کی کاغذی اور مالی مدد سے دوست بھی ولایت پہنچ گیا۔ وہاں سرکاری کاغذات میں اسے بتانا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ۔ اور ہوشیاری

سے کام لیتے ہوئے اس نے خود کو غیر شادی شدہ ہی لکھوا دیا۔ یہ فارن میں اس کے کسی نئے استاد کا پڑھایا ہوا پہلا سبق تھا، کیونکہ نئے ملک میں تارکینِ وطن کے بسنے پر قانونی پابندی لگ چکی تھی اور ٹکے رہنے کا واحد راستہ وہاں شادی کر لینا تھا۔

نئی سرزمین پر 'قلمی دوست' کو زیادہ چاق و چوبند اور نئی نئی راہیں بتانے والے نئے نئے ساتھی مل گئے تھے، اس لیے اپنے پرانے دوست کی ضرورت اسے شاذ ونادر ہی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی پرانی دوستی اور ممنونیت کے ناطے پرانا دوست خود ہی اس کے ہاں حاضری دینے آجاتا تھا۔ آخر وہ سیوارام کی تمام سیوائیں یک لخت کیسے نظر انداز کر دیتا؟

ایک روز قلمی دوست نے اسے بتایا کہ وہ شادی کر رہا ہے۔

"مگر تم تو پہلے سے شادی شدہ ہو۔"

"تم اتنے دن باہر رہ کر بھی بہت نادان ہو۔ بس دیکھتے جاؤ۔" (قلمی دوست، اسے اب 'تم' کہہ کر ہی مخاطب کرتا تھا)۔

پھر ایک دن 'قلمی دوست' نے ایک گوری میم سے شادی رچالی۔ اس موقعہ پر اس نے سب نئے نئے دوستوں کو مدعو کیا، مگر اپنے پرانے دوست کو نہیں بلایا، کیوں کہ اس کا سادہ دل ہونا اس کے لیے کوئی مصیبت بھی کھڑی کر سکتا ہے۔ شادی کے بعد ایک سال تک اس نے پرانے دوست کے گھر جھانک کر تک نہ دیکھا اور نہ اسے اپنے گھر آنے کا کوئی موقع دیا۔ دل بے ایمان تو بہانے ہزاروں۔

پھر ایک دن 'قلمی دوست' نے گوری میم سے طلاق لے لی، مگر اس وقت جب اسے 'گرین گارڈ' (یعنی وہاں رہنے اور کام کرنے کا اجازت نامہ) مل گیا۔ اب وہ ایسا کھرا سکہ بن چکا تھا جو بیرونی ممالک میں بھی چل سکتا تھا۔ چناں چہ وہ واپس اپنے وطن پہنچا اور اپنی بیوی سے کورٹ میں دوبارہ اس طرح بیاہ رچایا جیسے دو کنوارے ابھی ابھی ملے ہوں اور پہلی ہی نظر میں ایک دوسرے کے تیرِ نظر کے گھائل ہو گئے ہو۔ نئے بیاہ کی نئی تاریخ کا نیا سرٹیفکٹ حاصل کر کے وہ اپنی بیوی کے ساتھ ولایت آگیا کہ اب

سارے راستے صاف تھے۔ پھر پتہ نہیں حقِ نمک نے جوش مارا یا کوئی اور ضرورت درپیش آئی کہ اس نے پرانے دوست سے دوبارہ دوستی گانٹھی۔ ویسے بھی پرانے دوست کی دوستی بے ضرر اور فائدہ مند تھی، کیونکہ اس کی سادہ دلی سے ابھرنے والا امکانی خطرہ اب ٹل چکا تھا۔ اس طرح اب پرانے دوست کے ہاں اس کی آمد و رفت پھر شروع ہو گئی۔

چار سال بعد قلمی دوست کو وطن جانے کی ضرورت پیش آئی آخر اب بھاری جیبیں دکھانے اور سکے چھنکانے کا موقع آ گیا تھا۔ دولت کی نمائش کی غرض سے اسے چند ہفتوں کے لیے اپنوں میں جانا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے محض رسماً، اپنے پرانے دوست سے کہا کہ اس کی غیر حاضری میں وہ اس کی بیوی کا خیال رکھے۔ پرانے دوست نے اس رسمی بات کو دوستی کے فرض اور قرض کا درجہ دے دیا۔ اس نے سوچا، کیوں نہ محترمہ کو شہر کی قابل دید جگہیں ہی دکھا دی جائیں، تاکہ اکیلا پن اسے اداس نہ کرے۔ ایک جگہ اخلاقاً اس نے قلعہ کی دیوار پر چڑھتی ہوئی دوست کی بیوی کا ہاتھ تھام لیا کہ یہ ادھر ولایت میں عورت کے تئیں اخلاق کا ایک انداز بھی ہے۔ مگر دوست کی بیوی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اسے دوست کی بیوی کا یہ رویہ عجیب تو لگا، مگر اس نے اسے ایک باحیا خاتونِ مشرق کا انداز سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے لمحہ بھر کو یاد آیا کہ وہاں تو وہ ...... مگر اس نے اس بے ہودہ خیال کو دل سے نہ صرف جھٹک دیا، بلکہ دوست کی غیر حاضری میں اس کے گھر جانا بھی ترک کر دیا۔

چوتھے دن وہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا کہ برابر کے کیبن میں اس کی طرف پیٹھ کیے اس کے دوست کی بیوی ایک سفید فام شخص کے ساتھ شیمپین پیتی نظر آ گئی۔ وہ اس کے گورے گورے بازو کو تھامے کہہ رہا تھا: "کل ہی تم میرے دفتر آ جانا۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔ اچھی تنخواہ ہو گی۔"

اور اس سے اگلے ہفتے اس کا 'قلمی دوست' وطن سے واپس آنے کے بعد اس کے گھر آ کر اس سے جھگڑا کر رہا تھا۔ "تم میرے پیچھے میرے گھر آتے رہے۔ میری بیوی لحاظ اور شرم کی ماری تمہارے ساتھ باہر جاتی رہی اور تم اس حد تک گر گئے کہ ایک دن اس کا

بازو تھام لیا! وہ اگر اس روز سنسان قلعے سے بھاگ نہ آتی تو نہ جانے تم کیا کر گزرتے!"
اور اس روز سے ان کی دوستی کے بیچ ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے۔
خلیج کے اس پار پرانے دوست کے وہ دس ہزار روپے بھی ہیں جو اس نے 'قلمی دوست' کو نئے ملک میں بلوانے کے لیے اس کے ٹکٹ اور دوسرے لوازم پر صرف کئے تھے وہ ایک قلمی دوست کی بیوی کا ہاتھ تھامنے کی قیمت کے طور پر برابر ہوئے کھیل ختم، پیسہ ہضم۔

سبق

کھلے آسمان کی کھلی ہواؤں میں پہنچنے کے بعد آپ کو خیال رکھنا ہو گا کہ ہر خاردار تار سے، جس پر چڑھی ہوئی ربڑ کی خوبصورت گوری کھال کی پرت اور دل کش رنگ برنگے دھاگوں کے جال نے کرنٹ اور کانٹوں کو چھپا رکھا ہو، آپ کو خبردار اور بچ کر رہنا ہے۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں۔

اصلی ہیرے

بابر کا باپ شاہجہاں مڈل ایسٹ کے ایک امیر ملک میں مزدور تھا۔ وہ خود دیکھ آیا تھا مگر وہ ہندوستانی مزدوروں کی طرح دنیاوی مزوں سے دور ہرگز نہیں تھا بلکہ دنیا کی ہر آسائش اسے میسر تھی۔ صرف کمی تھی تو پہچان اور نام ونہاد کی۔ اس نے سوچا اگر وہ بھی باپ کی طرح باہر مزدور بن گیا تو وہاں کی بڑی بڑی مشینیں اس کی ہڈیوں کے چورے سے اُس کے لیے کوئی نہ کوئی محل تو ضرور کھڑا کردیں گی جو اس کے باپ کے گھر کی طرح ہر آرام و آسائش کی چیزوں سے بھرا پُرا ہوگا مگر شاید اسے وہ سب کچھ حاصل نہ ہو جس کا وہ تمنائی ہے۔ مال ودولت، حسن وعشق، نام شہرت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی الگ شان اور پہچان بھی تو دیکھنا چاہتا ہے اور یہ سب اسے صرف اپنے ہی ملک میں حاصل ہوسکتا ہے۔ تو چل بابر ہندوستان یعنی ہندوستان کے جنت نشان شہر بمبئی۔ اور بمبئی کی ہیرا نگری، فلم نگری! اس نے سوچا۔

عرب ممالک اور اس سے آگے یورپ سے لائے ہوئے اعلیٰ فرانسیسی، پرتگالی، انگریزی، ڈینش، سوئس اور جانے کہاں کہاں کے سوٹ، بوٹ، گینس، جینز، کوپے، شرٹس، ٹائیاں، عطریات اور جانے کیا کیا ساز وسامان اس کے پاس تھے۔ جن سے اس کا اتنا رعب پڑسکتا تھا کہ کوئی بھی اٹھ کر اسے اپنی کرسی چاہے پیش نہ کرے، کم از کم ساتھ والی کرسی پر بٹھانے میں تو ضرور فخر محسوس کرے گا۔

وہ اپنی ہر چمک دار چیز ایک سوٹ کیس میں بھر کر بمبئی پہنچ گیا یہ سوچ کر کہ ہر روز نئی سج دھج

سے فلم نگری کے گلی کوچوں میں پھرے گا تو بڑے بڑے سیٹھ اسے دروازوں میں کھڑے ہو ہو کر دیکھیں گے اور قاتل حسینائیں جھروکوں سے جھک جھک کر اسے گلدستے پیش کریں گی مگر ایسا ہونے سے پہلے ہی بڑی نگری کے کسی بڑے اٹھائی گیرے نے اسے پہلے ہی دن اس کے سوٹ کیس کے بوجھ سے آزاد کر دیا۔ اب اس کے تن پر ایک خوب صورت اور قیمتی سوٹ تھا اور جیب میں چند ہفتے اور کھینچ لینے کو چند سکے۔

اس نے سوچا جو کچھ باقی ہے اس کی چمک دمک سے اس چمکیلی دنیا میں اپنی جگہ بنانی چاہیے اس نے فلم سٹڈیوز کے چکر لگانے شروع کیے اور ہر چکر کے ساتھ اس کی بچی کھچی چمکیلی چیزوں کی دمک بھی ماند پڑتی گئی اور جب سب کچھ ماند میل دھیما اور پھیکا پڑ گیا اور اس کی آنکھیں جھوٹے لشکاروں سے آزاد ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ ہیرا نگری کے ہیرے صرف اپنے شوکیسوں کے شیشوں میں ہی چمکتے تھے۔ باہر کی دنیا میں آتے ہی سادہ پتھر ہو جاتے تھے۔ آخر اس کی قسمت نے یاوری کی اور اس نے وہاں ایک ایسا ہیرا تلاش کر ہی لیا جو باہر بھی ہیرا ہی تھا اور جو خود بھی کسی جوہری کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ اس بات سے انجان کہ وہ جوہریوں کے درمیان نہیں اناڑیوں کے بیچ آ پھنسا ہے۔ اس نے سوچا اگر اس سچے ہیرے کو ابھی سے نہ اچک لیا تو وہ بھی نمک کی کان میں نمک ہو جائے گا۔ اور گھسے ہوئے جوتوں، پھٹے ہوئے کپڑوں نے اب اسے اتنی عقل تو ضرور عطا کر دی تھی کہ وہ اصلی اور نقلی کی پہچان کر سکے۔ اس نے باقی سب کچھ چھوڑ دیا اور ہیرا اچک لیا۔ ہیرے کی کنی، کنی اب اس کے ساتھ تھی اور خوابوں کی نئی دنیا میں اس کی راہوں میں بچھی تھی۔ اصلی ہیرے پاس ہوں تو خواب تاج محلوں سے کم کے کیوں آنے لگے اور تاج محل بھی اپنے اصلی روپ میں آنے سے پہلے کسی کے خواب میں ہی تو آیا ہوگا۔

مصلحت

باپ بیٹا دونوں بھاگم بھاگ پلیٹ فارم میں داخل ہوئے۔ قلی سے سامان ڈبے میں کھولیا گاڑی چلنے کا سگنل ڈاؤن ہو چکا تھا مگر گارڈ نے ابھی ہری جھنڈی نہیں دکھائی تھی۔ ڈرائیور نے چلنے کی سیٹی نہیں دی تھی۔ پھر بھی باپ نے کہا۔ "بیٹا اندر بیٹھ جاؤ۔ چلتی گاڑی میں چڑھنا اچھا نہیں"

تابعدار بیٹے نے باپ کے پاؤں چھوئے اور اندر فرسٹ کلاس کے ڈبے میں کھڑکی کے پاس والی اپنی ریزرو سیٹ پر جا بیٹھا۔ باپ نے باہر پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے اسے نصیحتیں کرنی شروع کیں۔ بیٹا اپنے سامان کا خیال رکھنا۔ راستے میں کسی مسافر سے کھانے پینے کی کوئی چیز قبول مت کرنا۔ مسافروں سے زیادہ بحث و مباحثہ کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ جانے کون کیا ہے۔ کن دچاروں کا ہے۔ دہلی سٹیشن سے باہر قریب ہی بس ملتی ہے۔ ٹانگوں، رکشاؤں میں دھکے کھانے کی ضرورت نہیں اور ٹیکسی بالکل مت لینا۔ آج کل کے دہلی کے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بڑا اور کوئی چور نہیں۔ اور ہاں پہنچتے ہی خط ضرور لکھنا۔ اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پلیٹ فارم پر ہی میل ٹرین کی رفتار نے سفید ریش باپ کے باقی تمام الفاظ اور نصیحتیں ہوا میں اڑا دیں۔ بیٹا ہوا میں ہاتھ اور تابعداری میں سر ہلاتا رہ گیا اور لکھنؤ کا سٹیشن پیچھے چھوٹتا گیا۔ جب ٹرین شہر کے مضافات سے باہر نکل آئی تو بیٹے نے ماحول کا جائزہ لینے کو نظریں گھمائیں۔ ڈبے میں اس کے سوائے صرف ایک سواری اور موجود تھی۔ ایک ستائیس اٹھائیس

سالہ حسین اور جوان دوشیزہ۔

بیٹا اپنا تمام ساز و سامان بھول کر حسینہ کے قریب جا بیٹھا۔ راستے بھر اس سے دنیا بھر کے موضوعات پر بات چیت کی اور دہلی پہنچتے ہی لفٹ دینے کے بہانے حسینہ کو اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھا لیا۔ ڈرائیور کو لالچی اور ان کی موجودگی سے بے پروا پا کر اس کا حوصلہ بڑھا اور اس نے حسینہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ چھڑاتے ہوئے حسینہ بولی۔ "یہ کیا؟ آپ عمر میں میرے باپ سے بھی چار پانچ سال بڑے ہوں گے۔"

وہ بولا۔ "دیکھا نہیں۔ پتاجی ایک نادان بچہ سمجھ کر کس طرح مجھے نصیحتیں کر رہے تھے۔ جب کہ اب میں بچہ نہیں رہا۔ جوان ہو گیا ہوں۔"

چار دن بعد اپنی چھٹی ختم کر کے حسینہ اپنے دفتر پہونچی تو منیجر کی کرسی پر اپنے ہم سفر کو بیٹھے پایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے تین لفظوں "گڈ مارننگ سر" میں دنیا بھر کی ملائمت اور آنکھوں میں کسی محبوبہ کی سی بے باکی اور پیار لیے اپنے بوڑھے مگر جوان دل منیجر کے بہت ہی قریب جا کھڑی ہوئی، گاڑی والی یک طرفہ قربت سے کہیں زیادہ قریب۔

ہاؤس اینڈ ہوم

پہلے آدمی نے اپنے گھر کا نام 'ریسٹ ہاؤس' رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے گھر کے پائیں باغ میں ایک درخت پر ایک بارہ دری نما چاروں طرف سے کھلا لکڑی کا ایک گھونسلہ لگا ہوا تھا۔ جس میں وہ صبح سویرے پانی اور دانہ دُنکا ڈال دیتا۔ پرندے آتے، بارہ دری میں چند گھنٹے آرام کرتے، دانہ دنکا چگتے اور کھلی بارہ دری میں رہائش کی کوئی مناسب جگہ نہ پا کر اپنی راہ اڑ جاتے۔

وہ یورپ کے کونے میں بسے ایسے چھوٹے سے ملک، جو اپنی خوب صورتی کی مثال آپ ہی تھا، میں تارک الوطن تھا۔ اس ملک میں گاؤں کی سی سادگی اور حسن تھا۔ یورپی شہروں جیسی چمک دمک اور شور شرابہ بہت کم تھا یا تقریباً نہیں کے برابر تھا۔ ہاں اب آہستہ آہستہ اس میں یورپ کی تھوڑی بہت خود غرضی کا عنصر ضرور شامل ہو رہا تھا۔ اس کے ہم وطن، تیسری دنیا کے اس کے دوست جب اپنے کسی دفتری یا کاروباری کام، کھیل کود یا سیر سپاٹے کے سلسلے میں یورپ کے کسی شہر آتے تو تھک تھکا کر، اس کی پیار بھری دعوت پر اس کے پاس چند روز آرام کرنے پہنچ جاتے۔ اس چھوٹے سے ملک کے پاس دکھلانے لائق اتنا کم تھا کہ سب کچھ دو چار روز میں ہی ختم ہو جاتا اور باقی روز اس کے دوست اس کے خوب صورت پہاڑی، ندی کنارے والے کاٹیج نما گھر میں آرام سے گزارتے اور پھر اپنی راہ لیتے۔ یورپ کی بے لحاظ ہواؤں میں اس سے زیادہ نہ پہلے آدمی کی استطاعت میں تھا کہ

انھیں اور زیادہ ٹھہرنے کو کہہ سکتا اور نہ ہی تمناؤں میں۔

دونوں کی راہیں جدا جدا تھیں۔ خیالات میل نہیں کھاتے تھے مگر پھر بھی وہ دونوں دوست تھے۔ محض قلمی دوست کیوں کہ صرف ایسی ہی دوستی آسانی سے چل سکتی ہے۔

دوسرے آدمی کے گھر کے پائیں باغ میں بھی ایک درخت پر اس نے لکڑی کا ایک گھونسلہ لگوایا تھا جو چاروں طرف سے بند ہونے کی وجہ سے موسموں کی سردی گرمی، بارش طوفان سے بہت اچھی پناہ مہیا کرتا تھا۔ پرندے آتے، گھونسلے میں انڈے دیتے، بچے پیدا کرتے اور پر لگ جانے پر انھیں اپنے ساتھ اڑا کر واپس دور دیسوں کو چلے جاتے۔

تیسری دنیا کے اس مہمان نواز ملک کے اس بڑے سے شہر میں دوسرے آدمی کے گھر پر دوستوں کی محفلیں جمتی تھیں۔ شہر میں ہر قسم کی سہولت اور بڑے بڑے دفتر اور ہسپتال وغیرہ ہونے کی وجہ سے اس کے دوستوں کے بیٹے نوکریوں کی تلاش میں آتے تو مہینوں اس کے ہاں ٹھہرتے۔ بیمار دوست رشتہ دار کسی بڑے ہسپتال میں بیڈ ملنے سے پہلے اس کے ہاں قیام کرتے۔ ہسپتالوں میں جگہ کی کمی یا استطاعت کی کمی کے کارن اس کے دوستوں کی بیویاں یا بیٹیاں زچگی کے کئی کئی دن اس کے ہاں گذارتی تھیں۔ دوستوں نے پیار سے اس کے گھر کا نام 'میٹرنٹی ہوم' رکھ دیا تھا۔

دوسرا سچ

رسیٹورنٹ میں

"رادھا تم بہت سُندر ہو۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تم پر جان دیتا ہوں۔ تم سے اب ایک پل بھی دور نہیں رہ سکتا۔"

"دور تو مجھ سے بعد میں بھی تم کافی دنوں تک رہا کرو گے۔ تمہاری جاب ہی ایسی ہے باقی پیار کے بارے بھگوان کرشن نے بھی رادھا سے یہی کہا تھا مگر بعد میں اسے چھوڑ کر کئی اور رانیوں کا سوامی بن بیٹھا تھا۔"

"رادھا۔ ایک طرف تم ہو اور دوسری طرف ساری دنیا ہو تو میں ساری دنیا کو چھوڑ دوں گا۔"

"مگر بعض اوقات تم مرد لوگ ایک بلی کے بچے کے لیے بھی بیوی کو چھوڑ دیتے ہو۔"

کرشن کمار مسکرایا: "رادھا تم میں مزاح کا عنصر بہت زیادہ ہے۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔"

"مگر ہمارے معاملے میں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" کرشن کمار بولا۔

"اور اگر ہوا تو میں اسے نپٹنا بھی جانتی ہوں۔" ماڈرن کلجگیں رادھا رانی نے کہا۔

بیڈ روم میں

"رادھا آؤ۔ ایک کوشش اور کر دیکھیں۔"

"نہیں۔ بہت ہو چکا۔ میں تین لڑکیوں کی ماں بن چکی ہوں۔ بھگوان نے لڑکا دینا ہوتا تو ان ہی میں سے ایک کو لڑکا بنا دیتا۔"

"رادھا تم بہت ضدی ہو۔ میں یہ گھر بدلنا چاہتا ہوں کیوں کہ اس کے گارڈن کی مٹی میں گلاب نہیں اگ سکتے اور تم یہ جاننے کے باوجود کہ میں گلابوں کا کس قدر دیوانہ ہوں اس گھر سے چپٹی رہنا چاہتی ہو۔ میں اولاد نرینہ کا خواہشمند ہوں اور تم اپنی ہر لڑکی کو کسی بھی لڑکے سے کم نہیں سمجھتیں۔ میں کب تک تمہاری مانتا رہوں گا۔ بھگوان نے ہمیں سب کچھ دیا ہے تو ہم چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھی کیوں محروم رہیں۔ تم یہیں رہنا چاہتی ہو تمہاری خوشی مگر میں ایک دوسرا گھر لے رہا ہوں۔"

"اور یہ بھی کہہ دو۔ مجھ پر ایک سوکن بھی لا رہے ہو۔ ورنہ گھر والی کے بغیر ایک اور گھر کی کیا ضرورت؟" رادھا نے طنزاً کہا۔

"تم نے خود کہہ دیا ہے تو سن لو۔ میں نے بالکل ایسا ہی سوچا ہے۔"

"تمہاری مرضی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر پہلے صرف ایک کوشش مجھے بھی کر لینے دو۔ تم دعا اور دوا ہر طرح کی کوششیں کر چکے۔"

<u>پائیں باغ میں</u>

"رادھا۔ یہ گلاب کتنے خوب صورت ہیں۔ تم نے یہاں یہ کیسے پیدا کر لئے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں نے صرف بیج بدل ڈالا۔"

<u>کچھ عرصہ بعد</u>

"رادھا۔ ہمارا بیٹا بہت سندر ہے۔ مجھ تم ہم دونوں سے کئی گنا زیادہ خوب صورت۔ لگتا ہے جیسے کوئی آسمانی مخلوق ہو۔"

"نہیں۔ مخلوق تو اسی دنیا کی ہے صرف بیج دوسرا ہے۔"

داداجان

دور دراز بیٹھے ایک ادیب نے ایک افسانہ لکھا۔ بار بار اسے پڑھا۔ جب کچھ بھی خود اس کے پلے نہ پڑا تو بھاگا بھاگا پتاجی کے پاس پہنچا جو لفظوں کے ڈاکٹر تھے جیسے دانتوں کے ڈاکٹر، آنکھوں کے ڈاکٹر، ناک کان اور گلے کے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ پرانے ڈاکٹر تھے، لفظوں کی چیر پھاڑ کرتے تھے، علاج کرتے تھے۔ جانتے تھے کون سے لفظ کو کون سی بیماری ہے۔ کون سا قریب المرگ ہے۔ کون سا مر گیا حتیٰ کہ نام و نشان تک نہ چھوڑ گیا۔ کون سا مر تو گیا مگر امر ہو گیا۔ کچھ کچھ لفظوں کو امر کرنے میں ان کا بھی ہاتھ ہوتا تھا۔ انھوں نے افسانہ دیکھا۔ بولے۔

"بیٹا۔ سمجھ تو مجھے بھی کچھ نہیں آیا۔"

"پتاجی۔ آپ بزرگ ہیں، تجربہ کار ہیں۔ جو بات بیٹے کو سمجھ نہ آئے وہ باپ سے نہ پوچھے تو پھر کس سے پوچھے۔"

"نہیں بھئی۔ یہ افسانہ لکھ کر اب تو ہمارا پتا ہو گیا ہے۔"

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں پتاجی۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ۔ یہ افسانہ کہاں بھیج رہے ہو؟"

"ایک رسالہ ہے پنجاب سے نکلتا ہے۔"

"تو پنجابی کی ایک ڈکشنری اٹھاؤ اور دبا دب اس میں پنجابی کے زیادہ سے زیادہ

الفاظ گھسیٹر دو مگر ٹھہرو اسے دہلی، لکھنؤ یا یوپی کے کسی رسالے کو کیوں نہ بھیج دو۔"

"جی خط تو پنجاب کے ہی ایک ایڈیٹر کا آیا ہوا ہے۔"

"چھوڑ دو پنجاب کو۔ آج کل ہندی کا بول بالا ہے۔ ہندی کی ڈکشنری اٹھاؤ اور بس اس کا ہندی میں ترجمہ کر ڈالو۔"

"ترجمہ کر دوں؟"

"ارے بھئی لباس اردو کا، آتما ہندی کی۔"

"میں سمجھا نہیں پتا جی۔"

"میں بھی کچھ نہیں سمجھا مگر اتنا ضرور جان گیا ہوں کہ تجھے نیا جنم ملتے جا رہا ہے اور تو پھر سے نیا گل گوتھنا سا بچہ بن جائے گا۔ اور تجھے سب پیار کرنے لگیں گے۔"

"پتا جی۔ اب میں بھی کچھ کچھ جان گیا ہوں۔ لوگ آپ کو بھی اس بوڑھی عمر میں بچہ پیدا کر لینے پر جوان سمجھنے لگ جائیں گے۔ اور آپ سے ایسا خوب صورت بچہ پیدا کرنے کے طریقے سمجھنے کو دوڑ پڑیں گے۔"

کچھ عرصے بعد:

"بیٹا تم نے ٹھیک کہا تھا۔ معاف کرنا۔ مجھے آپ کو پتا جی کہنا چاہیئے۔ لوگ مجھ سے ایسا پیارا اور خوب صورت بچہ پیدا کر لینے کے گر پوچھنے لگے ہیں بلکہ کئی باتوں کی تشریح بھی چاہنے لگے ہیں۔ مانا کہ اس معاملے میں تم میرے پتا ہو مگر دراصل تو میں ہی تمہارا پتا ہوں اس لئے تمہارے نئے جنم کے ساتھ لوگوں نے تمہارا پتا مانتے ہوئے مجھے اپنا 'دادا جان' تسلیم کر لیا ہے۔

وہ بہت عرصہ تک اولادِ نرینہ کے لیے ترستا رہا اور دو لڑکیوں کے بعد تیسری اولاد جب بیٹا ہوا تو تقدیر اسے سات سمندر پار جرمنی لے آئی۔ نئی جگہ، نیا معاشرہ، نئی زبان نئے لوگوں میں اسے دل کی دنیا اور زیادہ اداس اور ویران محسوس ہونے لگی۔ پھر اچانک اس کے دوست کے پیار بھرے اور پُر خلوص خطوں کی بھرمار نے اس کی تمام فکریں، تمام غم چوس لیے۔ دوست نے لکھا کہ اس کے بیٹے نے اب اسے باپ ماننے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ کہتا ہے۔ میرا باپ تو میرا انکل ہے۔

پھر اس کا بیٹا یعنی اس کے دوست کا جوان بیٹا، جو بیٹھے بٹھائے، پلا پلایا، اس کا بیٹا بن گیا تھا، خود بھی اسے خطوط لکھنے لگا۔

"انکل۔ میں آپ کے لیے بہت اداس ہوں۔ انکل آپ کے بغیر میرا دل یہاں بالکل نہیں لگتا ۔۔۔ انکل میں آپ کے قریب رہنا چاہتا ہوں ۔۔۔ انکل میں آپ کو ہی اپنا پتا مانتا ہوں۔ ۔۔۔ انکل ۔۔۔۔۔"

آہستہ آہستہ اس کے نئے بیٹے کے خطوں کی تعداد بڑھتی گئی اور اس کے دوست کے خط کم ہوتے گئے۔ کبھی کبھی ایک آدھ خط دوست کا بھی آجاتا۔ ایسے ہی ایک خط میں اس نے لکھا کہ سریندر بیٹا تو آپ کا ہی ہے مگر میں باہر کا آدمی ہونے کے باوجود اس کی اتنی سی گارنٹی تو ضرور دے سکتا ہوں کہ وہ ہمیشہ آپ کا تابعدار رہے گا۔

اور یہ تابعدار بیٹا اس کے اشارے پر ایک دن اس کے پاس جرمنی پہنچ گیا۔ باپ بیٹے ہوسٹل کے ایک کمرے میں اکٹھے رہتے۔ بیٹا صبح اٹھتا۔ اسے گڈ مارننگ انکل کہتا۔ نیند میں ڈوبے ہوئے بزرگ کے پاؤں چھوتا اور تھوڑی دیر بعد گرم گرم چائے کا پیالہ ہاتھ میں لیے اسے جگانے پہنچ جاتا۔ ساتھ ہی ٹیپ ریکارڈر پر انکل کی پسند کا کوئی بھجن، گیت یا مکیش کی گائی ہوئی رکھائی لگا دیتا تو انکل کی آتما پرسن ہو جاتی اور اس کا رواں رواں بیٹے کو دعائیں دینے لگتا۔

بیٹے کی خدمتیں اور انکل کی اپنی فیکٹری کے شیف کے سامنے التجائیں آخر رنگ لائیں اور وہ بیٹے کو بھی فیکٹری میں اپنے ساتھ کام دلوانے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ نہیں جانتا کہ یہ یورپ کی ہواؤں کا اثر تھا، فیکٹری کا تھکا دینے والا کام، یا کام نکل جانے کے بعد کی لاپرواہی، کہ بیٹے نے اسے صبح کی چائے دینی بند کر دی اور آہستہ آہستہ دوسرے کاموں سے بھی ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا۔

انکل نے سوچا۔ چھوٹے سے احسان کے بدلے وہ اسے غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اسے بزرگ بننا چاہیئے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیئے۔ اور اس نے بیٹے کی جوان اور امنگوں بھری مصروفیتوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔

خزاں گئی، سرما آیا پھر موسم بہار، تو انکل کو شام، مائن ندی کنارے سیر کرنے کا شوق چرایا اور ایک دن اس کی آنکھوں نے عجیب نظارہ دیکھا۔ بیٹا ایک جرمن حسینہ کے ساتھ ندی کنارے والے پارک میں گھاس پر لیٹا محو بوس و کنار تھا۔ باپ کی نظریں حسینہ سے ملیں تو وہ مسکرا دی اور بیٹے نے تو نظریں ہی پھیر لیں دوسرے دن پھر اس نے انھیں اسی حالت میں دیکھا۔ تیسرے دن تو بیٹے نے ٹیپ ریکارڈر پر ایک ہندی گیت بھی لگا رکھا تھا۔

کھلم کھلا پیار کریں گے — نہیں ڈریں گے

گیت اسے منہ چڑاتا ہوا محسوس ہوا۔ رات کو بڑے پیار اور نرمی سے اس نے بیٹے سے کہا کہ اسے کم از کم اتنا لحاظ تو کرنا چاہیئے کہ اس کے سامنے اور اتنی کھلی جگہ پر وہ سب نہ کیا کرے جو وہ کر رہا ہے۔ بیٹے کے جواب دینے کے لہجے میں زبردست غصہ در آیا جیسے بزرگ اس کی آزادیوں میں مخل ہو رہا ہو۔ بولا۔

"آپ جو روز صبح سویرے ٹیپ لگا دیتے ہیں، کبھی سوچا ہے۔ اس سے مجھے کتنا دکھ کتنی تکلیف پہنچتی ہے۔" اس نے چڑا کر اور منہ بگاڑ کر گانے کے بول دہرائے۔
"آنکھیں بچھائے، باہیں پسارے، تجھ کو پکارے دیس تیرا۔ کیسا دیس، کیسی ماں۔ دھکے دے دے کر تو نکالا ہے بے روزگاری نے۔ کیا اپنی اتنی بڑی دھرتی ماں کے پاس میرے لیے چند نوالے نہیں تھے۔ اور سگے باپ نے تو مجھے کبھی اپنا بیٹا مانا ہی نہیں۔

نسخہ

لوگ کہتے وہ جھوٹا ہے۔ میں سمجھتا رہا وہ سچ نہیں بولتا ہوگا۔
یہ سچا ہے۔ یہ جھوٹ سے نفرت کرتا ہوگا۔
میں نے پہلے سے نفرت کی۔ دوسرے کی راہ اپنائی کیوں کہ بزرگوں، مقدس کتابوں اور سیانوں نے مجھے یہی سبق پڑھایا تھا کہ جھوٹے سے نفرت اور سچے سے نہ صرف پیار کرو بلکہ اس کے نقش قدم پر بھی چلو مگر میں زندگی کے ہر شعبے میں بری طرح ناکام رہا۔ دوست بھی سب آہستہ آہستہ میرا ساتھ چھوڑ گئے۔
پھر میں نے ان ناصح بزرگوں اور کامیاب زندگی گذارنے والوں کے طور طریقوں کا گہری نظر سے جائزہ لینا شروع کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری عادتیں بہت زیادہ ناقابل درستی کی حد تک بگڑ چکی ہیں اور میں غلط راہوں پر اتنا آگے نکل آیا ہوں کہ اب پیچھے مڑنا اور نئے سرے سے سفر شروع کرنا میرے لیے مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔
وہ جگہ اور ماحول کے مطابق جھوٹ کہاں اور سچ کہاں بولنے اور ان کی مقدار کو موقع اور محل کے مطابق کم یا زیادہ کرنے یا صرف سچ بولنے مگر دو سچائیوں کو ضرورت کے مطابق آگے پیچھے کر لینے کے گر جان گئے تھے اس لئے زندگی میں کامیابی و کامران ہے۔ میں صرف سیدھا اور کھرا سچ بولتا تھا اسلیے ذلیل و خوار ہوا۔

نام : ہر چرن چاولہ
جائے پیدائش : داؤد خیل (ضلع میانوالی) پاکستان
آبائی مقام : میانوالی
انعامات و اعزازات : اتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ
میرا اکادمی لکھنؤ
مغربی بنگال اُردو اکادمی کلکتہ

۱۹۸۷ء میں نارویجین رائٹرس سنٹر، اوسلو کی جانب سے منعقدہ 'بک ڈے' کی رسمِ افتتاح کرنے کا اعزاز بخشا گیا جس میں تقریباً ایک سو ادباء نے اپنی تازہ تخلیقات سامعین کے سامنے پیش کیں۔

ہر چرن چاولہ کے افسانہ "گھوڑے کا کرب" کو بلغاریہ کے Zemedelsko Zname اخبار نے اپنے انٹرنیشنل ایوارڈ ZLATEN KLAS (سنہرے گیہوں کی بالی) کے پہلے انعام سے نوازا ہے۔ کہانیوں کے اس مقابلے میں کئی ملکوں کے تقریباً ڈیڑھ سو افسانے شامل ہوئے تھے۔ جیوری بلغاریہ کے مانے ہوئے ادیبوں، صحافیوں اور مدیروں پر مشتمل تھی۔ گئے سال چاولہ کے افسانوی مجموعے "آتے جاتے موسموں کا سچ" کو بھاشا وبھاگ پٹیالہ کی طرف سے راجندر سنگھ بیدی ایوارڈ عطا ہوا۔

مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے چاولہ ۱۹۷۵ء میں اوسلو (ناروے) پہنچ گئے اور اب وہیں مقیم ہیں۔ اب تک چاولہ تقریباً پچیس ممالک کی سیر کر چکے ہیں۔ یہ چاولہ ہی کا کمال ہے کہ دُنیا کے اس انتہائی شمالی خطہ کے یخ بستہ برفوں کے درمیان بھی اُردو کی جگمگاتی شمع روشن کئے بیٹھے ہیں۔

دسمبر ۱۹۹۱ء میں ماریشس میں منعقدہ عالمی اُردو کانفرنس میں چاولہ نے رائٹرس یونین، اوسلو (ناروے) کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔

موجودہ سروس : اوسلو میں۔